فجعلنٰھم سلفاً ومثلاً للاٰخرین

علمائی سلف

مصنفہ

محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی (صدر یار جنگ)

علمائے سلف

فہرست مضامین

عنوانِ دوم

حق پسندی و راست گوئی

عنوانِ سوم

اختلاف و اتفاق

عنوان چہارم

حسن معاشرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ طبع دوم

الحمد للہ کہ رسالۂ ہذا دوبارہ چھپتا ہی۔ پہلے مطبوعہ نسخے عرصہ ہوا ختم ہو چکے۔ اربابِ شوق کا تقاضا باقی ہی۔ علمای سلف کو قدیم و جدید دونوں خیال کے سرگروہوں نے اسنادِ قبول بخشیں۔ ایک بابو صاحب نے انگریزی ترجمہ کی اجازت حاصل کی۔ رسالے پر نظر ثانی ہوئی ہی۔ بعض مضامین کا اضافہ ہوا ہی۔ عبارت میں بھی تصرف کیا گیا ہی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

حبیب گنج
سنہ ۱۳۲۷ھ

محمد حبیب الرحمن خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

دیباچہ طبع اول

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند ‏ ‏ ‏ سماعِ بلبلِ شوریدہ رفت و حال نماند
نشانِ لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی ‏ ‏ ‏ برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

شوال ۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلما کا اول اجلاس شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا جس میں دیارِ ہند کے اکثر مشاہیر علماء رونق افزا تھے۔ بزم اُن کے جمالِ وکمال سے روشن تھی اور نگاہ اُن کے کمالِ جمال سے منور۔ اور ایک ایسا پاکیزہ منظر پیش نظر تھا جو تاریخ ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر تھا۔ میری

آنکھیں جب اُن نورانی شکلوں کے دیدار سے فیض یاب ہوئیں تو چشمِ بصیرت میں ایک نور پیدا ہوا جس کی روشنی میں وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جو فضائے عالم میں صدہا برس کی راہ طے کر چکا ہے۔ یعنی متاخرین کا مجمع دیکھ کر متقدّمین کا تصوّر بندھا اور اُن کے حالات کے مطالعے کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ یہ شوق ہنوز دل میں قایم تھا کہ جناب مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے ایک نقشۂ مضامین شائع فرمایا جس میں چند عنوان اس غرض سے درج تھے کہ آیندہ جلسۂ مذکور کے لیئے اُن پر مضامین لکھے جائیں۔ اتفاقاً ان میں ایک عنوان علمائے سلف بھی تھا۔ اس نقشے کو دیکھ کر پہلی تحریک میں ایک تازہ جوش پیدا ہوا اور باوجود بے مائیگی یہ سوچ کر کہ اس ذریعے سے چندے اِن بزرگوں کی بھی معنوی ہمنشینی نصیب ہو جائیگی، عنوانِ بالا کو میں نے لے لیا ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

اس رسالے کی تیاری کے واسطے حسبِ ذیل کتابیں میں نے لفظ بہ لفظ پڑھیں اور اُن میں سے حالات انتخاب کیئے۔ تذکرۃ الحفاظ از امام شمس الدین

ذہبی المتوفی ۸۴۳ھ (کشف الظنون) مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن۔ وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان از قاضی القضاۃ ابی العباس احمد ابن خلکان المتوفی ۶۸۱ھ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۰ھ نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء از امام ابی البرکات عبد الرحمن ابن محمد انباری المتوفی ۵۷۷ھ۔ (کشف الظنون) مطبوعہ مصر ۱۲۹۴ھ عیون الانباء فی طبقات الاطباء از طبیب عالم موفق الدین ابو العباس احمد ابن قاسم المعروف بابن ابی اصیبعہ المتوفی ۶۶۸ھ مطبوعہ مطبع وہبیہ مصر ۱۲۹۹ھ الشقائق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ از مولا طاشکبری زادہ رومی المتوفی ۹۶۸ھ (العقد المنظوم) مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۰ھ العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم مطبوعہ مطبع بالا۔ ان کتابوں کے علاوہ جستہ جستہ ذیل کی کتاب سے بھی مدد لی گئی ہے۔

مقدمہ فتح الباری للامام ابن الحجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ (کشف الظنون) مطبوعہ مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۲ھ الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان للمفتی احمد بن الحجر المکی المتوفی ۹۷۳ھ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۱ھ الرحمۃ الغیثیہ بالترجمۃ اللیثیہ للحافظ ابن حجر العسقلانی مطبوعہ مطبع میریہ ۱۳۰۱ھ

رحلۂ ابو عبد اللہ محمد ابن عبد اللہ المعروف با بن بطوطہ مطبوعہ مطبع وادی النیل مصر ۱۲۸۷ھ کامل از علّامہ ابن اثیر جزری المتوفی ۶۳۰ھ (ابن خلکان) مطبوعہ مطبع فوائد التحریر مصر ۱۳۰۳ھ الملل والنحل از عبد الکریم شہرستانی مطبوعہ ۱۲۸۸ھ بستان المحدثین از شاہ عبد العزیز صاحب مرحوم مطبوعۂ مطبع منشی محمد منیر ۱۲۷۷ھ صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب از نوفل آفندی مطبوعۂ مطبع امیرکان بیروت۔ کشف الاسرار شرح اصول فخر الاسلام بزدوی از امام عبد العزیز بخاری المتوفی ۷۳۰ھ مطبوعۂ مطبع صحافیۂ عثمانیہ قسطنطنیہ ۱۳۰۸ھ۔ اس فہرست کے پیش کرنے سے اپنا بلاغِ نظر جتانا مقصود نہیں بلکہ یہ اظہار مطلوب ہے کہ یہ کتاب کس قسم کے مادے سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ اس موقع پر اتنی گزارش کی اور جسارت کی جاتی ہے کہ اس ناچیز تحریر میں جو بحث حالات و واقعات سے کی گئی ہے یا جو نتیجہ اُن سے نکالا گیا ہے وہ مورخانہ حیثیت سے ہے نہ مفتیانہ یا متکلّمانہ حیثیت سے اور اس سے مقصود گزشتہ علمائے اہل اسلام کے حالات کا لکھنا ہے نہ کسی دینی مسائل کا فیصل اور طے کرنا۔ حوالۂ واقعات لکھتے وقت حسب ذیل علامتوں سے کام لیا گیا ہے۔

ع ابن بطوطہ کی سیاحت کا آغاز ۷۲۵ھ میں ہوا اور اختتام ۷۵۶ھ میں

تذ - تذکرۃ الحفاظ - ابن - ابن خلکان - شق - شقائق نعمانیہ - عیون - عیون الانباء

نزہتہ - نزہتہ الالباء - مقدمہ - مقدمۂ فتح الباری - ج - جلد - ص - صفحہ -

شقائق نعمانیہ کی تقسیم جلدوں پر اس کے مصنف نے نہیں کی ہی - مگر چونکہ یہ کتاب تاریخ ابن خلکان کی دونوں جلدوں کے حاشیے پر درج ہی اور دونوں جلدوں کے صفحوں کا شمار جدا جدا ہی اس لیئے حاشیئے کی کتاب کی بھی تقسیم کرنی پڑی -

ہر واقعے کا حوالہ بقید جلد و صفحۂ کتاب اس کتاب کے ہر صفحے کے نیچے لکھ دیا گیا ہی اور اس طرح میں نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا ہی جو بحیثیت ناقل میرے ذمے تھا

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

خادم طلبا

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

بھیکن پور - ضلع علی گڑھ
۱۹ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ

عنوانِ اوّل

طلبِ علم

علمائے سلف کے جن حالات سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں ان میں طلبِ علم کو سب سے اوّل ہم نے قایم کیا ہے اہلِ علم کی زندگی کے مختلف مدارج ہیں۔ یہ منزل سب سے پہلی ہے اور یہ تقدم نہ صرف بلحاظ زمانے کے ہے بلکہ باعتبار اہمیت اور شان کے بھی۔ کیونکہ یہی وہ منزل ہے جو اس بات کا فیصلہ کردیتی ہے کہ کون منزلِ مقصود تک پہونچیگا اور کون حرماں نصیب ہوگا ایک عالم کا ذکر آپ آگے پڑھینگے کہ ایک شب اپنے دو طالب علموں کو انھوں نے دیکھا کہ ایک تکیہ کا سہارا لئے کتاب دیکھ رہا تھا دوسرا دو زانو مستعد بیٹھا مُطالعے میں مشغول تھا اور وقتاً فوقتاً کچھ لکھتا بھی جاتا تھا۔ جوہر شناس اُستاد نے یہ ماجرا دیکھ کر اوّل کی نسبت کہا کہ اِنَّہٗ لَا یَبْلُغُ دَرَجَۃَ الْفَضْلِ[۱] دوسرے کی بابت فرمایا کہ سَیُحَصِّلُ الْفَضْلَ وَیَکُوْنُ لَہٗ شَانٌ فِی الْعِلْمِ[۲] تجربے نے ثابت کیا کہ پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ پس جو منزل اس طرح آیندہ زندگی کا فیصلہ کردینے والی ہو اُس کے مہتم بالشان ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ اس منزل کو اگر صرف اوّل منزل کہہ کر چھوڑ دیا جائے تو ایک پہلو اُس کا بیان ہوگا۔ جس طرح یہ منزل سب سے اوّل ہے اُسی طرح سب سے آخر ہے بلکہ یہ کہنا قطعاً مبالغے سے مبرّا ہے کہ باکمال علما کی زندگی میں اوّل سے آخر تک یہ منزل ختم نہیں ہوتی۔ آپ آگے

۱؎ اس کو فضیلت کا رتبہ حاصل نہ ہوگا۔ ۲؎ یہ شان دار فاضل ہوگا۔

کے صفحوں میں بہت سے واقعات اس دعوے کی تائید میں پائینگے۔ اہل کمال نوے برس کی عمر میں بھی طالب علم تھے اور جب اُن کی روح سکرات کے تلاطم میں تھی اُن کا دل و دماغ خدمتِ علم میں مصروف تھا

مہرِ تو در وجودم و عشقِ تو در سرم ۔ با شیر اندرون شد و با جان بدر شود

شیخ الاسلام انصاری نے فرمایا ہے کہ ھٰذَا الشَّانُ شَانُ مَنْ لَیْسَ لَہٗ شَانٌ سِوٰی ھٰذَا الشَّانِ۔ یعنی طلب علم اُن جوان مردوں کا کام ہے جن کو یہی دھن ہو۔ طالب علمی کے مختلف دور ہیں۔ پہلا دور مکتب یا مدرسے میں اُستاد کی زیرنگرانی ختم ہوتا ہے اور فی الواقع اس کو بنیادِ کمال سے زیادہ کوئی لقب نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص ایک عالی شان عمارت کا منصوبہ دماغ میں قایم کرے اور اُس کی بنیاد بھر کر سطح زمین سے کچھ بلند کردے اور اتنی محنت کے بعد وہ یہ خیال کرے کہ میں مکان بناچکا تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ عالی شان عمارت بن چکی چند روز میں ہوا اور بارش کے صدمے اتنی بنیاد کو بھی نسیاً منسیا کردینگے اور اس کے بانی کی پست ہمتی کی ایک عبرت ناک یادگار قایم رہ جائیگی۔ بجنسہٖ یہی حال اُن ہونہار طالب علموں کا ہے جو مدرسہ چھوڑکر یہ سمجھ لیں کہ ہم عالم بن چکے۔ یہ طلبہ بھی اپنی ہونہاری کا خون کرکے اپنے اُستاد اور دوستوں کے دلوں کو حسرت کا داغ دینگے۔ دوسرا دور طالب علمی کا مدرسے کے بعد شروع ہوتا ہے جس میں انسان خود شاگرد بنتا ہے اور خود اُستاد ؎

معلّم کیست عشق و کنجِ خاموشی دبستانش ۔ سبق نادانی و دانا دلم طفلِ سبق خوانش
زہر کس نا یداین اُستادی شاگردی نہ ہر کہ ہے ۔ بدخشاں باشد و ہر سنگریزہ لعلِ بدخشانش

اس دور کی انتہا وہ ہے جو بلند خیال ابن العلا نے مقرر کی ہے یعنی مَادَامَتِ الْحَیٰوۃُ تَحْسُنُ بِہٖ[۱] یہی دورِ کمال کا دور ہے۔ پس طالب علمی اور کمال گویا ایک ہی ہیں اور اسی لحاظ سے ہم نے

---

[۱] جب تک زندگی بخیر رہے۔

طلب علم کو اوّل اور آخر منزل قرار دیا ہے۔

جن جواں مردوں نے میدانِ طلب علم کو طے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ راہ کیسی معرکہ خیز اور صبر آزما ہے۔ کہیں افلاس کا مردم خوار دیو اپنی منحوس صورت دکھلاتا ہے اور قوتِ لایموت کے حاصل ہونے کی بھی کوئی شکل نظر نہیں آتی کبھی جڑی بوٹی کے پتوں پر بسر کرنی ہوتی ہے اور کبھی نان بائی کی دُکان پر صرف بوئے طعام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں محنت و مشقت سے دل گھبراتا ہے اور چھکّے چھوٹتے ہیں۔ کسی کو ناز و نعمت کے کرشمے اپنی طرف کھینچتے کسی کی نفسانی خواہشیں دست بگریباں ہوتی ہیں۔ غرض ایک ہنگامۂ بلاخیز سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن ارادوں میں ذرا بھی قوت کی کمی ہوتی ہے وہ ان معرکوں کے مقابلے میں پست ہو جاتے ہیں اور ان کی زبانِ حال پر لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ کا مضمون ہوتا ہے۔ لیکن سچی طلب اپنا راستہ صاف کر کے طالب کو مطلوب تک پہونچا دیتی ہے۔ جس قدر دقت اور صعوبت پیش آتی ہے ان بہادر طالبوں کے عزم زیادہ مستحکم اور حوصلے زیادہ بلند ہوتے جاتے ہیں۔ اگر حوصلوں میں وسعت اور ارادوں میں استحکام نہوتا تو اہلِ اسلام کو شیخ الاسلام بقی بن مخلد امام بخاری اور حکیم ابو نصر فارابی نصیب نہوتے۔ کیا چقندر کے پتے اور جنگل کی گھاس کھا کر اور شب کو پاسبانوں کی لالٹینوں سے مطالعہ کر کے امام اور حکیم بن جانا آسان ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ کون سی قوت تھی جس نے علی بن عاصم عراقی اور ابن سنجر کو ناز و نعمت کے آغوش سے چھین کر راہ طلب میں سرگرداں کر دیا اور اتنا پھرایا کہ ایک کو مسندِ عراق اور دوسرے کو حافظ کبیر بنا کر چھوڑا۔ بے شک یہ طلبِ صادق ہی کا کرشمہ تھا۔ اتنی تمہید امر ناظرین با تمکین کے ذہن نشین کر دیگی کہ ہم علمائے سلف کی طلب علم کی نسبت کس کس پہلو پر بحث کرنے والے ہیں۔ اور سچی طلب کا معیار ہمارے پاس کیا ہے۔

افلاس

انسان کا حوصلہ پست کرنے والی اور ہمت کی کمر توڑ دینے والی دنیا میں کوئی چیز

غالباً افلاس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ مفلسی میں پھنس کر آدمی عزم کا استحکام اور ارادے کی استواری بالکل کھو بیٹھتا ہے۔ اور دل و دماغ کی شگفتگی جو تمام بلند خیالیوں کا سرچشمہ ہے قطعاً معدوم ہو جاتی ہے۔ اگر ایک سرسبز چمن کی سیرابی کے سارے ذرائع مسدود کر دیئے جائیں تو وہ مایۂ بہجت سراپا وحشت بن جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ جب چمن کے نشوونما یافتہ گلبن جل کر ہیزم خشک ہو جائیں اُس میں تازہ نوبادوں کے اُگنے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ بعینہٖ یہی مصیبت افلاس کے ہاتوں انسانی دل و دماغ پر نازل ہوتی ہے۔ مفلسی نہ صرف موجودہ خیالات کا ستیاناس کرتی ہے۔ بلکہ آیندہ حوصلوں اور اُمنگوں کا پیدا ہونا بھی بند کر دیتی ہے ؎

انچہ شیراں را کند روبہ مزاج | احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

خدا جانے کتنی قابلیتوں کا خون اس مردم خوار دیو کی گردن پر ہے اور کس قدر استعدادیں اس بے درد کے ہاتوں ضائع ہوئی ہیں۔ جو بلند ہمت نوجوان اپنے بڑھتے ہوئے ارادوں میں افلاس کے پھندے میں پھنس کر مایوسی کے ساتھ بے دست و پا رہ جاتے ہیں اُن کی مثال بجنسہٖ ایسی ہے کہ ایک سیاہ ہرن اپنی طاقت اور قوت کے زعم میں اکڑا چلا جا رہا ہے میدان کی وسعت اُس کے دل میں اُمنگیں پیدا کر رہی ہے اور قدم قدم پر اُس کی چال بڑھتی جاتی ہے ناگاہ وہ صیاد کے مضبوط پھندوں میں (جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں) پھنس کر گر پڑا۔ اب وہ جس قدر اپنی قوت صرف کرتا ہے اُتنی ہی اُن پھندوں کی گرفت سخت ہوتی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے یہ منظر ملاحظہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جنگل کا آزاد منش پہلوان کیسا اُن پھندوں میں پڑ کر اپنی چوکڑی بھول جاتا ہے۔ آہ اے افلاس! تو آج تو مسلمانوں کے حوصلوں پر ہمیشہ سے زیادہ بیداد کر رہا ہے۔ جس قوم میں حوصلوں کا قحط اور ہمت کا کال ہو اُس میں اگر کچھ اولوالعزم ہونہار ہائے کمال نکل آئیں تو اُن کو تو پیس کر رکھ دے۔ ہائے یہ کیسا ظلم ہے۔ لیکن تجھ کو یاد ہو گا کہ تیرا

زور آج کل کی طرح ہمیشہ ہماری ہمتوں پر غالب نہیں رہا۔

کیا تجھ کو یاد نہیں ہے کہ جب حافظ الحدیث حجاج بغدادی شبابہ کے یہاں تحصیل علم کو جانے لگے تو اُن کی مقدرت کی کل کائنات یہ تھی کہ اُن کی دل سوز والدہ نے سو کلچے پکا دیئے تھے جن کو وہ ایک گھڑے میں بھر کر ساتھ لے گئے۔ روٹیاں مہربان ماں نے پکا دی تھیں سالن ہونہار اور دلیر فرزند نے خود تجویز کر لیا اور اتنا کثیر و لطیف کہ آج تک صدہا برس گزرنے کے بعد بھی ویسا ہی تر و تازہ موجود ہے وہ کیا ہے دجلے کا پانی۔ حجاج ہر روز ایک روٹی دجلے کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور استاد سے پڑھتے جس روز وہ روٹیاں ختم ہو گئیں ان کو استاد کا فیض بخش دروازہ چھوڑنا پڑا۔[1] شیخ الاسلام بقی بن مخلد اس سے بھی زیادہ مؤثر حکایت بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس پر ایام طالب علمی میں اتنا سخت زمانہ گزرتا تھا کہ بے مائیگی کی وجہ سے چقندر کے پتے کھا کھا کر بسر کرتا۔[2] پتے کھانا کچھ زیادہ عجیب بات نہیں۔ بھوک وہ بلا ہے کہ لخت جگر بچوں کے کباب ماں باپ کو کھلا کر چھوڑتی ہے۔ قابل تحسین و ہزار آفریں یہ امر ہے کہ جس افلاس نے چقندر کے پتے کھانے پر مجبور کیا اُس میں اتنی قوت نہ تھی کہ علمی شوق پر غالب آتا اور اِس دلیر طالب علم کی ہمت توڑ دیتا۔ یاد ش بخیر امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک سفر میں تہی دستی نے اتنا مجبور کیا کہ تین دن برابر انھوں نے جنگل کی بوٹیاں کھائیں۔[3] ابن المقری۔ ابو الشیخ۔ اور طبرانی یہ تینوں شیخ عصر ایک زمانہ میں مدینہ طیبہ میں طالب علمی کرتے تھے۔ ایک بار ان پر ایسا وقت آیا کہ خرچ کی قلت نے بہت پریشان کیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ روزے پر روزہ رکھا۔ بھوک نے جب بہت مضطرب کیا تو انھوں نے حضرت سرورِ کائنات کا وسیلہ ڈھونڈا اور سب کے سب مل کر آستانہ پاک پر گدایانہ حاضر ہوئے اور

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۰۔ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۲ [3] مقدمہ صفحہ ۵۶۶۔

صدا دی کہ "یا رسول اللہ الجوع" اس کے بعد طبرانی تو وہیں بیٹھ گئے اور کہا کہ یا موت آ گئی یا روزی۔ ابن مقری اور ابو الشیخ لوٹ کر فرودگاہ پر چلے آئے۔ وہ صدا خالی کب جاتی کچھ عرصے کے بعد دروازہ مکان پر کسی نے دستک دی دروازہ جو کھولا تو دیکھا کہ ایک والا دودمان علوی مع دو غلاموں کے تشریف فرما ہیں اور غلاموں کے سروں پر بہت سا سامان ہے۔ اُن کو دیکھ کر علوی نے کہا کہ آپ لوگوں نے میری شکایت حضور نبوی میں کی خواب میں آپنے مجھ سے فرمایا ہے کہ تمھارے پاس کچھ پہنچا دوں۔ چنانچہ یہ حاضر ہے[1]۔

شیخ الفقہا امام برقانی جب اسفرائن پڑھنے گئے تو اُن کے پاس تین اشرفیاں اور ایک درہم تھا۔ سوء اتفاق سے اشرفیاں راہ میں گم ہو گئیں درہم باقی رہ گیا اسفرائن پہونچکر درہم ایک نانبائی کے یہاں جمع کر دیا۔ ہر روز اُس سے دو روٹیاں لے لیتے۔ اور احمد بن بشر کے یہاں سے ایک جز کتاب کا لا کر شام تک نقل کرتے اور شام کو نقل شدہ جز واپس پہونچا دیتے تیس جز نقل ہوئے تھے کہ درہم ختم ہو گیا اور انھوں نے مجبور ہو کر اسفرائن سے سفر اختیار کیا[2]۔ امام ابو علی بلخی جب عسقلان میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت پہونچی اور ضعف نے لکھنے سے معذور کر دیا جب بھوک کی اذیت برداشت نہ ہو سکی تو نانبائی کی دُکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ کھانے کی خوشبو سے ہی کچھ تقویت طبیعت کو پہونچ جائے[3]۔

فن حدیث کے عالی مرتبہ امام ابو حاتم رازی اپنا قصہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں زمانہ طالب علمی میں چودہ برس بصرے رہا۔ ایک مرتبہ تنگ دستی کی یہ نوبت پہنچی کہ کپڑے تک بیچ کھائے جب کپڑے بھی نہ رہے تو دو دن بھوکا رہا آخر ایک رفیق سے اظہار حال کیا خوش قسمتی سے اُس کے پاس ایک اشرفی تھی نصف اُس نے مجھ کو دے دی[4]۔ امام ابن جریر طبری نے تنگی خرچ

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۸۳[2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۷۵[3] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۳۱۷[4] تذ ج ۲۔ صفحہ ۲

کے سبب سے اپنے کرتے کی دونوں آستینیں بیچ کر کھائی تھیں[۱]۔ ابن ابی داؤد جب کوفے طالب علمی کرنے گئے تو صرف ایک درہم پاس تھا اس کا باقلا خریدا۔ باقلا کھاتے اور طالب علمی کرتے[۲] شیخ الاسلام ابو العلاء ہمدانی کو بغداد میں کسی نے اس حال میں دیکھا کہ رات کو مسجد کے چراغ کی روشنی میں جو بلندی پر تھا کھڑے کھڑے لکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کو روغن خریدنے کی مقدرت ہوتی تو یہ تکلیف وصعوبت کیوں گوارا کرتے[۳]۔ حکیم ابو نصر فارابی جس کا ایک عالم میں شہرہ ہے اس کی نسبت بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ وہ عہد طالب علمی میں تہی دستی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھا۔ تاہم اس کا شوق بیکار رہنے والا نہ تھا۔ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے کام لیتا۔ اور ان کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کر دیا[۴]۔

سفر آج کل مسلمانوں کی علمی دنیا میں جو افسردگی چھائی ہوئی ہے اس پر لحاظ کر کے یہ عنوان نرالا معلوم ہوگا۔ موجودہ حالت دیکھ کر مشکل سے باور آسکتا ہے کہ کبھی ہم میں بھی ایسے لوگ تھے جو علم کی دھن میں بر اعظم اور سمندر کاٹ کر ڈالنا ایک بات سمجھتے تھے جو ایک کتاب کی خاطر صدہا میل پیادہ پا جاتے اور جو صرف نباتات کے حالات تحقیق کرنے ملکوں ملکوں پھرتے اگر ان کے دلوں میں وہ جوش اور دماغوں میں وہ ولولہ نہ ہوتا تو ہم کو ابن بیطار اور سید شریف نصیب ہوتے۔ ابو حاتم رازی اور حافظ ابن طاہر کے کارنامے ہمارے قومی خیالوں میں فخر نہ پیدا کرتے۔ علمائے سلف کے حالات دیکھنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے دل میں شوق علم کی ایک بے تابی تھی جو ان کو کسی شہر یا ملک میں قرار نہیں لینے دیتی تھی اور ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں اور ایک بر اعظم سے دوسرے بر اعظم میں لئے پھرتی۔ اگر آج ہمارے دلوں

۱؎ تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۸۰ ۲؎ تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۲۹ ۳؎ تذ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۰ ۴؎ عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۴

میں اُس کا ایک شمہ بھی ہوتا تو ہم علم وفن میں ہر قوم وملت کے مقابلے میں پست ہوتے! اور حق یہ ہے کہ جب ہمارے ارادے پست ہماری ہمتیں قاصر ہو رہی ہیں تو ہمارا اسلاف کے کارناموں پر اترانا ان بزرگوں کے نام کو دھبہ لگانا ہے اور اپنے آپ کو حقیر کرنا۔ جس ملت کے پیشوا کا یہ مقولہ ہو کہ اطلبوا العلم ولو بالصین اُس ملت کے افراد کو سفر کا نام سن کر لرزہ چڑھے ع ھذا لعمری فی القیاس بدیع اور جس قوم کے بچے بچے کے کان اس حکیمانہ مقولے سے آشنا ہوں کہ ؎

تا بدکان خانہ در گردی ہرگز اے خام آدمی نہ شوی

وہ گھر سے باہر قدم نہ نکالے ھذا الشیئ عجاب۔ محدثین کے حالات پڑھنے سے لفظ "رحلت" بجائے خود ایک مقدس لفظ معلوم ہونے لگتا ہے۔ حیف ایک وہ گروہ قدسی تھا کہ جس نے سیاحت کرتے کرتے خود لفظ میں تقدس پیدا کر دیا اور ایک ہم ہیں کہ گھر میں گھسے گھسے سارے عالم کے یہ ذہن نشین کر دیا کہ "مسلمان" اور "سفر" ان دونوں لفظوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یہ قصہ دراز ہے اور ہم کو دوسری داستان بیان کرنی ہے اس لیئے اس سے قطع نظر کر کے ہم اپنے مدعا کی طرف رجوع کرتے ہیں سب سے اول ہم اُن سیاحتوں کا ذکر کرینگے جو علمائے سلف نے احادیث نبویہ کے حاصل کرنے کے واسطے کیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں سفر کا رواج ابتداءً اسی پاک فن کی بدولت ہوا ہے۔ محدثین کے سفر کا حال بیان کرنے کے بعد ہم اُن علما کا حال لکھینگے جنھوں نے حدیث کی سوا اور علوم کے حاصل اور دقائق علمیہ کے حل کرنے کے واسطے دور دراز ممالک کے سفر اختیار کیئے تھے

امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب تابعی سے روایت کی ہے کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پیادہ پا چلا ہوں[1]۔ امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین۔ خراسان۔ عراق

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۸

شام اور مصر کا سفر کیا تھا[1]۔ صحیح بخاری کے مصنّف امام بخاری نے چودہ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی۔ اُن کی والدہ اور خواہر سفر میں نگراں تھیں۔ بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک اُس عالی مقام امام[2] کے سفر کی فہرست میں ہیں۔

امام ابوحاتم رازی نے اپنی سرگزشت خود بیان کی ہے کہ میں نے تین ہزار فرسخ سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی ہے۔ (ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے لہٰذا اُن کی پیادہ روی نو ہزار میل سے زائد ہوئی) یہ اُن کی سیاحت کی انتہا نہیں بلکہ شمار کی حد ہے۔ کیونکہ امام ممدوح فرماتے ہیں کہ اُس کے بعد میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا[3]۔

امام فسوی نے تیس برس سفر میں بسر کر دیئے[4]۔ شیخ الاسلام بقی ابن مخلد نے دو سو اسی شیوخ سے حدیث روایت کی ہے۔ خود اُنھوں نے فرمایا ہے کہ میں جس شیخ کے پاس گیا پیادہ پا گیا[5]۔ محدث اندلس (اسپین) ابن حیون نے حدیث اُندلس۔ عراق۔ حجاز اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی[6]۔ یہ معلوم نہیں کہ اُنھوں نے یہ سفر کس راستے سے کیا لیکن نقشے کے معائنے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر یہ سفر دریا کے راستے سے کیا گیا تو پورا بحیرۂ روم اور تمام وکمال بحر احمر اُنھوں نے طے کیا ہوگا۔ اور اگر خشکی میں کیا ہوگا تو طنجہ سے لے کر سوئز تک سارا برِاعظم افریقہ اُنھوں نے پیے سپر کیا ہوگا اُس کے بعد اگر براہِ راست یمن آئے تو کل بحر احمر میں سفر کر کے یمن پہونچے ہونگے اور اگر بیت المقدس وغیرہ کی جانب چلے گئے ہونگے تو شام و حجاز و عراق میں پھر کر اُنھوں نے منزل علمی ختم کی ہوگی۔ مگر چونکہ اُن کے سلسلۂ سفر میں مصر کا ذکر نہیں اس لیئے غالباً بحری راستے سے یہ سفر ہوا ہے۔ کیونکہ خشکی کے راستے میں ضرور مصر پڑتا

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۴ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۲۴ [3] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۴۷

[4] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶۰ [5] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۵ [6] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۴

اور یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی طالب علم مصر جاتا اور وہاں کے مشایخ سے استفادہ نہ کرتا۔ اسپین سے یمن براہِ راست ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ ہے۔

ابن المقری بیان فرماتے ہیں کہ میں نے صرف ایک نسخہ ابن فضالہ کی خاطر ستر منزل کا سفر کیا تھا۔ اس نسخے کی ظاہری حیثیت یہ ہے کہ اگر کسی نان بائی کو دیا جائے تو وہ ایک روٹی بھی اس کے عوض میں دینا گوارا نہ کریگا۔ (ایک منزل معمولی طور پر بارہ میل کی قرار دی گئی ہے پس اگلے علما آٹھ سو چالیس میل ایک ایک کتاب کی خاطر طے کر ڈالتے تھے) اس کے علاوہ امام موصوف نے چار مرتبہ مشرق (ممالک ایشیا) اور مغرب (ممالک افریقہ و اسپین) کا سفر کیا تھا اور دس دفعہ بیت المقدس گئے تھے[۱]۔ حافظ ابن مفرح نے سعید بن الاعرابی سے حدیث کی سماعت مکۂ مکرمہ میں کی۔ ابن اشد سے دمشق میں۔ قاسم بن اصبغ سے قرطبہ (کارڈوا ملک اسپین) میں۔ ابن سلیمان سے طرابلس میں۔ محمد سے مصر میں اور دیگر مشایخ سے جدہ۔ صنعا اور بیت المقدس میں[۲]۔ یہ مقامات اگر نقشے میں دیکھے جائیں تو تین براعظموں میں بکھرے ہوئے ملینگے۔ قرطبہ یورپ میں۔ مصر افریقہ میں۔ طرابلس سے مراد اگر طرابلس شام ہے تو ایشیا میں ہے۔ ورنہ افریقہ میں باقی مقامات ایشیا میں۔ عبرت کا مقام ہے کہ جو مقامات ایک زمانے میں ہمارے پاک مذہبی علوم کے سرچشمہ تھے وہاں آج کوئی مذہب اسلام کا ماننے والا تو بڑی بات ہے جاننے والا بھی نہیں۔ اسپین میں اگر کوئی شخص اب جاکر سیاحت کرے تو کیا اس کے گمان میں بھی آسکتا ہے کہ دنیائے اسلام کے نامور عالم اور مشایخ بیسیوں سیکڑوں ہزاروں اس سرزمین سے اٹھے تھے۔ ابن عبدالبر حمیدی۔ شیخ اکبر کہاں کے تھے؟ اسی اسپین کے جو آج یورپ میں ⟨مل⟩ کر بھاگے ہوئے غلام کی طرح اپنے قدیم آقا کی صورت سے بھی بیزار ہے۔ اگر ہم عبرت حاصل

[۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۸۳ [۲] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۱۲

کریں تو ہماری آنکھیں کھولنے کے واسطے یہ واقعہ کم نہیں کہ مادر زاد نابینا حافظ الحدیث ابوالعباس رازی اپنے نبی پاک کے اقوال و افعال کی شیفتگی میں بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کرتے پھرتے تھے۔[1] امام ممدوح باوجودیکہ دنیا کے دیکھنے سے محروم تھے تاہم اُن کی بھی سوانح عمری باب سیاحت سے خالی نہیں۔[2] حیف ہم پر جو خدا کی دی ہوئی ایک جوڑ دو آنکھیں رکھتے ہیں عالم کو دیکھتے ہیں اور پھر بھی آنکھیں بند ہیں۔ حافظ ولید سرقسطی (باشندہ سراگوسا ملک اسپین) کے حالات میں امام ذہبی فرماتے ہیں رحل من اقصی الاندلس الی خراسان یعنی انھوں نے انتہائے اندلس سے خراسان تک سفر کیا۔ حافظ ممدوح سراگوسا میں پیدا ہوئے تھے اور سرزمین دینور (واقع ایران) میں آرام کر رہے ہیں۔[3] امام ابو زکریا کے سفر کا آغاز بخارا سے اور انجام قیروان (واقع الفریقیہ) پر تھا۔[4]

حافظ ابن طاہر مقدسی نے جتنے سفر طلب حدیث میں کئے اُن میں کبھی اُنھوں نے کسی سواری کا سہارا نہیں لیا۔ سواری اور بار برداری دونوں کا کام وہ اپنے ہی نفس سے لیتے تھے سفر پیادہ پا کرتے تھے اور کتابوں کا پشتارہ پشت پر ہوتا تھا۔ مشقت پیادہ روی کبھی کبھی یہ رنگ لاتی کہ پیشاب میں خون آنے لگتا۔ اسی جفاکشی سے جو سیاحت حافظ ممدوح نے کی اُس میں حسب ذیل مقامات منجملہ اور مقاموں کے تھے۔ بغداد، مکہ مکرمہ، جزیرہ تنیس[5] (واقع بحیرہ روم) دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، رحبہ[6]، لوقان، مدینہ طیبہ، نہاوند، ہمدان، واسط، ساوہ، اسد آباد، انبار، اسفرائن، آمل، اہواز، بسطام، خسرو جرد، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصرہ، دینور[7]، ری، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ۔[8]

---

[1] بلخ سے بغداد براہ بخارہ ۱۳۶۵ میل ہے [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۲۳ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۳۳ و ۲۸۰ و ۸۱ [4] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۵۱ [5] بکسر تائے مثناۃ و کسرہ نون مشدد و سکون یائے تحتانی و سین مہملہ [6] بضم رائے مہملہ و سکون حائے مہملہ [7] بکسر دال مہملہ و فتح نون [8] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۴۰

حافظ ابو عبد اللہ اصفہانی ایک مرتبہ اپنے مقامات رحلت کی تفصیل بیان کرنے لگے کہ میں حدیث حاصل کرنے گیا ہوں۔ طوس، ہرات، بلخ، بخارا، سمرقند، کرمان، نیشاپور، جرجان۔ غرض اسی طرح وہ نام لیتے گئے یہاں تک کہ ایک سو بیس مقامات کے نام لے ڈالے۔[1] میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ایک سو بیس مقاموں کے نام مسلسل لیے جائیں تو سننے والے گھبرا جائینگے۔ آفریں اس باہمت جوانمرد پر جو اتنے مقاموں کا سفر کرتے کرتے نہیں گھبرایا۔

واقعۂ ذیل اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ کیا شوق علم کے واسطے سفر کرنے کا اُن دنوں مسلمانوں کے دلوں میں تھا۔ امام اسمٰعیل نے جب محمد بن ایوب رازی کی خبر وفات سنی تو روئے چیخے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈالی۔ اُن کی پریشانی دیکھ کر سارے گھر والے جمع ہو گئے اور پوچھا خیر ہے کیا حال ہے۔ اُنھوں نے دلگیر ہو کر کہا کہ تم لوگ مجھ کو سفر کرنے سے روکتے رہے آخر محمد بن ایوب وفات پا گئے اب میں اُن کو کہاں پاؤنگا۔ گھر والوں نے اُن کو تسلی دی اور انتظام کر کے ماموں کے ہمراہ شہر نسا کو ایک دوسرے شیخ وقت ابن سفیان کی خدمت میں بھیجدیا۔ اسمٰعیل کا سن اُس وقت سترہ برس کا تھا تاہم اتنی عمر تک بھی گھر میں بیٹھا رہنا اُنھوں نے مصیبت خیال کیا۔[2]

اسی کے قریب قریب امام ابو سعد کا واقعہ ہے کہ جب وہ سولہ برس کی عمر میں سفر کر کے حافظ ابو نصر زینبی سے پڑھنے بغداد گئے تو وہاں پہنچ کر اُن کے وفات پانے کی خبر سُنی۔ اس جگر خراش خبر نے ایسا صدمہ ابو سعد کے دل کو پہنچایا کہ وہ چیخ کر روئے۔ طمانچوں سے منہ کو لال کر لیا اور حسرت سے کہا کہ من این لی علی بن الجعد عن شعبۃ[3]

امام عز الدین مقدسی چودہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے واسطے بغداد پہنچ گئے تھے۔[4]

---

[1] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۵۳ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۹۱ [3] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۸۰ [4] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۹۳

حافظ ابوالخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اولاً تمام ملک اسپین میں سفر کیا وہاں سے فارغ ہو کر مراکش (مراکو) آئے۔ مراکش اور دیگر ممالک حبش کی سیاحت کے بعد مصر پہنچے اور مصر کے بعد شام، عراق عرب، عراق عجم اور خراسان کا سفر کیا۔ اور اس طرح تین برّ اعظم اُن کے ملک پیما قدموں کے نیچے سے نکل گئے۔[1]

امام ابوالولید باجی شہر باجہ میں (جو اشبیلیہ کے متصل اسپین میں واقع تھا) پیدا ہوئے تھے علوم عقلیہ پڑھنے کے واسطے سفر کر کے موصل آئے اور وہاں ابوجعفر سمنانی سے ان علوم کو حاصل کیا۔[2]

فن ادب کے مشہور امام کسائی ایک مجلسِ علما میں اکثر جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو وہاں پہونچے تو بہت خستہ ہو گئے تھے۔ اپنی خستگی ظاہر کرنے کے لئے اُنھوں نے کہا ”عییت“ (بالتشدید) یعنی میں تھک گیا۔ اہلِ مجلس نے ٹوکا کہ تم غلط لفظ استعمال کر رہے ہو اُنھوں نے وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ اگر تمھاری مراد ماندگی ہے تو اعییت کہو اور اگر درماندگی کا اظہار مقصود ہے تو لفظ عییت (بالتخفیف) استعمال کرو۔ کسائی کے دل پر اس اعتراض سے ایک چوٹ لگی اور فوراً مجلس سے باہر نکل آئے اور یہ تہیہ کر لیا کہ وہ فن سیکھنا چاہیئے جس سے پھر آیندہ ایسی خفت کسی محفل میں حاصل نہ ہو۔ یہ عزم کر کے فن ادب کے اُستاد یگانہ خلیل بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ مگر جو رتبہ امامت اُن کو اس فن میں ملنے والا تھا اُس کے حصول کے لئے خلیل کی مجلس کافی نہ تھی۔ ایک دن ایک بدوی نے اُن پر یہ طعن کیا کہ تم کان ادب بنی تمیم اور بنی اسد کو چھوڑ کر عربیت حاصل کرنے بصرے آئے ہو۔ یہ چبھتا ہوا فقرہ کسائی کے دل میں اثر کر گیا اور اپنے علامہ استاد سے کسی موقعے پر اُنھوں

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۸۱ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۷۱

نے پوچھا کہ آپنے فن ادب کہاں سیکھا۔ اُستاد نے جواب دیا کہ حجاز[1]۔ تہامہ اور نجد کے جنگلوں میں۔ یہ سُن کر کسائی کے سر میں تازہ سودا پیدا ہوا اور شہر چھوڑ کر صحرا کی راہ لی۔ اور قبیلہ در قبیلہ اتنے پھرے کہ اُس فن کے امام بن گئے جس کے نہ جاننے سے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ کیا مبارک تھی کسائی کی غلطی جس نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو صحیح عربی پر قادر کر دیا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے مسلمانوں کی علمی حمیت کیسی حساس تھی جس کو جوش میں لانے کے لیئے ادنی تحریک کافی ہوتی تھی۔ شاید بیجا نہ ہوگا اگر ہم اس کی اور دو ایک مثالیں ہدیۂ ناظرین کریں۔ ایک دوسرے امام ادب سیبویہ کا قصہ ہے کہ ابتدائے طالب علمی میں وہ فقہ اور حدیث پڑھا کرتے تھے۔ نحو سے اُس وقت تک چنداں مناسبت نہ تھی۔ اُس زمانے میں وہ حماد بن سلمہ کے مستملی[2] بھی تھے ایک روز کسی حدیث کی روایت میں حماد نے الفاظ لیس ابا الدرداء املا کیئے۔ سیبویہ نے اُن کو ادا کرتے وقت لیس ابو الدرداء سامعین کو سُنایا۔ شیخ نے کہا کہ غلط لفظ مت بتاؤ لیس ابا الدرداء کہو۔ اس گرفت سے سیبویہ کو نہایت انفعال ہوا اور اُنھوں نے دل میں کہا کہ میں وہ علم کیوں نہ سیکھوں جو ایسی غلطیوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ اُنھوں نے نحو سیکھنی شروع کی اور اس جہد اور کوشش سے سیکھی کہ سیکڑوں برس سے طلبہ اُن کا نام لے لے کر نحوی ہو رہے ہیں۔ اشبیلیہ کے مشہور طبیب قاضی ابوبکر کو آغاز عمر میں شطرنج کی بہت لت تھی۔ مثل ہے کہ کار بکثرت۔ کثرت نے وہ مہارت پیدا کی کہ اُن کا لقب شطرنجی پڑ گیا۔ یہ ذلیل لقب قاضی صاحب کے دل کو صدمہ پہونچاتا تھا۔ آخر اُن کی غیرت نے یہ مشورہ دیا کہ کسی علم میں کمال پیدا

---

[1] جزیرہ نمائے عرب پانچ حصوں پر منقسم ہے پہلا یمن دوسرا حجاز تیسرا تہامہ چوتھا نجد پانچواں یمامہ (صناجۃ الطرب)

[2] اگلے زمانے میں طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ اُستاد کسی اونچے مقام پر بیٹھ کر کسی موضوع کی نسبت زبانی تقریر کرتا تھا اور شاگرد اُسکو سنتے اور ضبط کرتے تھے اس طریقہ کا نام املا تھا۔ وقت ضرورت ایک یا زائد اشخاص اس غرض سے کھڑے ہو جاتے تھے کہ اُستاد کے الفاظ بجنسہٖ شاگردوں تک پہنچاتے جائیں اُن لوگوں کو مستملی کہتے تھے۔ یہ طریقہ یورپ کے لیکچر کے طریقے سے مشابہ تھا۔ [3] نزہۃ صفحہ ۲

کرنا چاہیئے تاکہ اس علم کی نسبت یہ داغ بدنامی مٹا دے۔ غور کرکے اُنھوں نے طب کو پسند کیا اور اس فنِ شریف میں وہ کمال اور نام پیدا کیا کہ آج قریباً سات سو برس کے بعد ان کا حال آپ میرٹھ میں سُن رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نام آوری کے سامنے وہ بدنام کنندہ لقب کیا ٹھہرتا لوگ ابوبکر طبیب کو دیکھ کر شطرنجی قاضی صاحب کو بھول گئے[۱]۔ ادیب مشہور ابن جنی موصل میں فنِ نحو کا درس دیا کرتے تھے ایک روز اسی میدان کے شہسوار ابو علی فارسی وہاں وارد ہوئے اور ایک مسئلے میں جو ابن جنی سے اُلجھے تو وہ دم بخود رہ گئے اُن کو حیران دیکھ کر پختہ کار ابو علی نے طنزاً کہا۔ زببت قبل ان تحصرم[۲] اور اتنا کہہ کر وہاں سے چلے آئے اُن کے چلے آنے کے بعد ابن جنی نے دریافت کیا کہ یہ کون تھے۔ لوگوں نے کہا ابو علی فارسی یہ سُن کر ابن جنی مسند تدریس چھوڑ کر ابو علی کی شاگردی کے شوق میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب تک یہ اُن کی فرودگاہ پر آئیں وہ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ آخر اگلی منزل پر جا لیا اور تلمذ کی آرزو ظاہر کرکے ساتھ ہو لیے۔ جب تک ابو علی زندہ رہے اُنھوں نے اُن کا دامنِ عاطفت نہیں چھوڑا۔ اور اس طرح داغ خامی اپنے دامنِ حال سے چھڑا ڈالا۔ آمدم برسرِ مطلب امام نصر بن شمیل نے چالیس برس صرف مختلف قبائل کی زبانوں کی تحقیقات کی خاطر صحرائے عرب میں بسر کر دیئے[۳]۔ اندلس کے طبیب ابن رومیہ نے اُن نباتات کے حالات دریافت کرنے کے لیئے جو مغرب میں پیدا نہیں ہوتیں مدتوں سیاحت کی۔ اسپین سے مصر آئے اور مصر سے شام و عراق کا سفر کیا۔ ان ممالک کے تمام نباتات کو خاص اُن کی روئیدگی کے مقامات میں جا کر مشاہدہ کیا۔ اور اُن کے افعال و خواص کی تحقیقات کی[۴]۔ اسی طرح علم نباتات کے بے نظیر عالم

---

۱ عیون - ج ۲ - صفحہ ۸۰ ۲ نزہتہ - صفحہ ۸۰ حصرم غورہ انگور کو کہتے ہیں اور زبیب کہتے ہیں انگور خشک کو جو کشمش کے نام سے مشہور ہے پس اس عبارت کے معنی یہ ہوئے کہ تم خام ہونے سے پہلے پختہ ہو گئے ۳ نزہتہ صفحہ ۱۱۱ ۴ عیون - ج ۲ - صفحہ ۸۱

ضیاء الدین ابن بیطار نے خاص نباتات کی تحقیقات کی غرض سے ممالک روم، یونان، اور اسپین کو چھان ڈالا۔ ان ملکوں کی تمام بوٹیاں اُن کی پیدائش کی جگہ جا کر دیکھیں اور اُن کے احوال تحقیق کرکے قلمبند کیے۔ ابو المنظور نے بہت سی نئی نباتات ایسی دریافت کیں جن کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں نہ تھا۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جو مقامات روئیدگی نباتات کے واسطے مشہور تھے مثلاً جبل لبنان (شام)، اُن میں پھرتے اور بوٹیوں کو دیکھتے اور جب نکلتے ایک مصوّر ہر رنگ کی روشنائی لیے اُن کے ہمراہ رہتا۔ نباتات کا خود مشاہدہ کر لینے کے بعد مصوّر کو دکھلاتے اور وہ اس کے رنگ، شاخ اور برگ و بیج کا اندازہ کرکے ہو بہو اس کی تصویر کھینچتا۔ یہ محقق طبیب ایک بار کے مشاہدہ پر قانع نہ ہوتا۔ بلکہ نشو و نما کے مختلف مدارج میں نباتات کا معائنہ کرتا۔ ایام نمو و تازگی کی علیحدہ تصویر کھچواتا اور زمانہ کمال کی جدا۔ اور جب وہ بوٹی خشک ہو جاتی تو ایک تیسرا نقشہ لیا جاتا۔ اسی طرح ہر بوٹی کی تصویریں اُس نے اپنی کتاب میں (جو ادویۂ مفردہ کے حال میں تھی) درج کی تھیں۔ جن کو دیکھ کر ناظرین کتاب ان نباتات کی مختلف اشکال صحیحہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے تھے۔ کاش ان دنوں میں چھاپا ہوتا تو آج ایک عمدہ ثبوت اگلے مسلمانوں کی علمی تحقیقات کا ہم پیش کر سکتے۔[۱]

علامہ سید شریف کو ایام طالب علمی میں یہ شوق ہوا کہ شرح مطالع خود اس کے مصنف سے پڑھیں۔ اسی دُھن میں وہ ہرات پہونچے اور علامہ رازی سے ملے۔ اُن کی عمر اس وقت دسویں منزل کی انتہا پر پہنچ چکی تھی اور قویٰ اپنی آخری بہار دکھا رہے تھے۔ کہن سال علامہ نے جوان ہمت سید کو پڑھانا اپنی طاقت سے باہر سمجھ کر اُن سے کہا کہ تم میرے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ چلے جاؤ اُس کا پڑھانا میرا پڑھانا ہے اور چلتے وقت سفارش لکھدی۔

---

[۱] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳، [۲] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۹

میر سید شریف کا شوق اُن کو خراسان سے مصر لے پہنچا۔ قاہرہ پہنچکر وہ مبارک شاہ سے ملے اور اُستاد کا خط اُن کو دیا۔ سفارش کے اثر سے یہ حلقۂ درس میں تو داخل کر لئے گئے۔ لیکن نہ اُن کا مستقل سبق مقرر ہو سکا اور نہ جماعت میں قرأت کی اجازت ملی مجبوراً سماعت پر قانع ہونا پڑا۔ ایک شب مبارک شاہ صحن مدرسہ میں ٹہل رہے تھے کہ ایک جانب سے کسی کی آواز کان میں آنے لگی متوجہ ہو کر سُنا تو میر سید شریف کہہ رہے تھے۔ قال المصنف[1] کذا وقال الاستاذ کذا واقول کذا۔ خوبیٔ بیان مبارک شاہ کے دل میں گھر کر گئی اور صبح کو اُنھوں نے سید جرجانی کو سب طلبہ پر مقدم کر دیا۔[2] جہاں پیما ابن بطوطہ جب اسکندریہ پہنچا تو شیخ روزگار برہان الدین اعرج کے حضور میں بھی گیا۔ شیخ نے اثنائے ملاقات میں اُس سے اپنے تین بھائیوں کو سلام پہنچانے کی فرمایش کی جن میں سے ایک فریدالدین نامی ہند میں تھے دوسرے زین الدین سندھ میں اور تیسرے برہان الدین چین میں۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے دورانِ سیاحت میں ان سب کو مقامات مذکورہ میں پایا اور مشتاق بھائی کا سلام پہنچا دیا۔[3]

اُس زمانے میں سفر جن مصیبتوں سے ہوا کرتا تھا اور سیاحت میں جو صعوبتیں اُٹھانی پڑتی تھیں وہ ذیل کے واقعے سے خیال میں آسکتی ہیں:

امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ سفر میں ایک دفعہ میں جہاز سے اُترا تو خرچ بالکل پاس نہیں رہا تھا دو میرے رفیق اور تھے اُن کا بھی مضمون واحد تھا۔ ہم تینوں نے تین دن فاقے سے پیدل سفر کیا۔ آخر تیسرے دن ایک مقام پر کثرت ضعف نے تھکا کر گرا دیا۔ رفیقوں میں ایک بیچارہ بڈھا تھا وہ گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد ہم دونوں نے پھر ہمت

---

[1] یعنی مصنف کتاب نے یوں کہا۔ اُستاد نے یوں کہا اور میں یوں کہتا ہوں [2] شق ج ۱ ص ۱۹۸ [3] رحلة ج ۱ ص ۱۱

باندھ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ بڈھے کو دیکھا تو بالکل غافل تھا مجبوراً اُس کو وہیں چھوڑا اور ہم آگے بڑھے تھوڑی دُور چلے تھے کہ میرے حواس نے جواب دیا اور میں غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ رفیق بڈھے کی طرح مجھ کو بھی راہ میں پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھا۔ حسن اتفاق سے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس کو ایک کشتی نظر آئی جو قریب ہی ایک مقام پر مسافر اُتار رہی تھی۔ یہ دیکھکر اس نے اظہار مصیبت کے لئے اپنی چادر ہوا میں اُڑائی اس نشان بیچارگی کو دیکھکر مسافر متوجہ ہوئے اور کچھ لوگ اُس کے پاس آئے اور تشنگی سے بے دم دیکھکر پانی پلایا۔ جب پانی پی کر اُس کو تسکین ہوئی تو کہا کہ میرے دو رفیق اور اسی مصیبت کے مارے پیچھے چھوٹ گئے ہیں اُن کی خبر گیری ضرور ہے۔ مہربان مسافر یہ سن کر ہماری طرف آئے۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک آدمی مونھ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔ جب مجھ کو ہوش آگیا تو پانی پلایا۔ اس کے بعد ہم سب مل کر بے کس بڈھے کے پاس گئے اور اُس کی بھی خدمت کی۔ آخر ہم نے ایک مقام پر چند روز ٹھہر کر آرام کیا تب جان میں جان آئی[1]۔ حیف! ہمارے اسلاف ایسے اور ہم اُن کے اخلاف ایسے کہ ہمارے مقابلہ میں دنیا کی ساری قومیں علم و حکمت کی زیادہ قدر شناسی کی مدعی ہیں۔ اگر پچھلی ہمت کا ادنیٰ اثر بھی ہم میں ہوتا تو آج امتحان مقابلہ ہمارے واسطے ایک مہیب مسٔلہ قرار نہ پاتا اور ہر صیغے اور شعبے میں ہم رعایت کی ذلیل صدا بلند نہ کرتے۔ جس طرف کان لگائیے مسلمان طلبہ اور اسلامیہ مدارس میں افلاس افلاس کی صدا بلند ہے۔ انصاف بالائے طاعت ست۔ لاکھ افلاس سہی لیکن چقندر کے پتے اور جڑی بوٹی کھانے کا اتفاق تو نہیں ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ شوق اور ہمت نہیں ورنہ یہی کڑوے گھونٹ شربت کی طرح خوش گوار ہو جاتے اور ساری کڑی منزلیں آسان ہو جاتیں۔

کتابوں کا لکھنا چھاپے نے اس زمانہ میں کتابوں کا وجود اتنا آسان کر دیا ہے کہ

---

[1] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۴۷

اب اس وقت کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے جو اگلے زمانے میں کتابوں کے بہم پہنچانے میں پیش آتی تھی۔ آج کل عمدہ سے عمدہ کتاب دام خرچ کرنے سے بلا دشواری مل سکتی ہے۔ لیکن پہلے یہ بات کہاں تھی۔ جو بھاری کام اب پیسے اور پتھر نے اٹھالیا ہے وہ اُس وقت کے طلبہ کو خود کرنا پڑتا تھا۔ یعنی وہ اپنے واسطے کتابیں خود لکھتے تھے گویا چلنے کے واسطے اُن کو سڑک بھی خود بنانا پڑتی تھی۔ شقائق نعمانیہ میں لکھا ہے کہ ابتداءً جب علامہ تفتازانی کی تصانیف روم میں پہنچیں اور درس میں مقبول ہوئیں تو اُن کے نسخے دام خرچ کرنے پر بھی نہیں ملتے تھے۔ مجبوراً علامہ شمس الدین کو علاوہ جمعے اور سہ شنبہ کی معمولی تعطیلوں کے دو شنبے کی تعطیل مدارس میں اور مقرر کرنا پڑی۔ پس ہفتے میں تین دن طلبہ کتابیں لکھتے تھے اور چار دن پڑھتے تھے[1]۔ کثرتِ مشق اور رات دن کے لکھنے نے اگلے لوگوں کو تحریر پر ایسا قادر کر دیا تھا کہ اب اُن کی حکایتیں مشکل سے باور ہوتی ہیں۔

حافظ ابن فرات بغدادی نے جب وفات پائی تو کتابوں کے اٹھارہ صندوق چھوڑے جن کتابوں سے اٹھارہ صندوق بھر گئے تھے اُن میں سے اکثر خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ خوبیٔ تحریر کی سند اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ محدثین کے نزدیک اُن کی لکھی ہوئی کتابیں صحتِ نقل اور جودتِ ضبط میں حجت اور سند خیال کی جاتی تھیں[2]۔ سبط ابن جوزی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا (شیخ ابن جوزی) کو ایک بار سرِ منبر کہتے سنا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ جس شیخ وقت نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کی ہوں اُس کا دو ہزار جلدیں لکھ لینا ناممکن نہیں[3]۔ جن قلموں سے اُنھوں[4] نے حدیث شریف کی کتابیں لکھی تھیں۔ اُن کا تراشہ جمع کرتے گئے تھے۔ جب وفات پانے لگے تو وصیت کی کہ غسل کا پانی

---

[1] شق۔ ج ۱ صفحہ ۳۰ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۲۰ [3] تذ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۳۸ [4] یعنی شیخ ابن جوزی نے

اُسی تراشے سے گرم کیا جائے چنانچہ اُن کے غسل کا پانی اُسی پاک ایندھن سے گرم ہوا[1]

حضرت یحییٰ بن معین نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ میں نے اپنے ہات سے چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔[2] امام ابواُسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر میں وفات پائی تاہم سلسلۂ تحریر آخر عمر تک قائم رہا۔ اُن کے بیٹے نے بیان کیا ہی کہ میرے والد نے جب اشعار عرب مُدوّن کئے تو کچھ اوپر اسّی قبائل کا کلام تھا۔ ایک قبیلے کا کلام شائع کرچکتے تو اُس کے شکرانے میں ایک نسخہ کلام اللہ کا لکھ کر مسجد میں پہنچا دیتے۔ اس طرح اسّی سے زیادہ نسخے کلام پاک کے اُنھوں نے لکھ کر وقف کردیئے[3]۔ بعد وفات امام ابوجعفر طبری کی تصانیف کا حساب لگایا گیا تو ابتدائے شباب سے یوم رحلت تک چودہ ورق روزانہ کا اوسط پڑا اور عام تحریر کا اندازہ کیا گیا تو چالیس ورق یومیہ ہوئے[4]۔ حکیم مظفر مصری کے حال میں علامہ ابن ابی اصیبعہ لکھتے ہیں۔ عجیب تر یہ بات ہی کہ اُن کے کتاب خانے میں ہزاروں کتابیں ہر فن کی تھیں۔ مگر کوئی کتاب کسی فن کی اُن کے یہاں ایسی نہیں ملتی جس پر خود اُن کے قلم کی کچھ نفیس و نادر باتیں فن کتاب کے مناسب لکھی ہوئی نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھ سے بکثرت طب اور دیگر فنون کی کتابیں حکیم مذکور کے کتاب خانے کی دیکھی ہیں جن پر اُن کا نام اور فوائد متفرقہ متعلق کتاب درج تھے[5]۔ قوتِ تحریر پر واقعۂ ذیل بھی عمدہ شاہد ہی۔ مفتی قسطنطنیہ ابوسعود رومی نے بارہا ایک ایک دن میں ہزار ہزار رقعوں کا جواب لکھ ڈالا جن میں سے ایک بھی خوبیٔ اسلوب اور حسن معنی کے لحاظ سے گرا ہوا نہیں ہوتا تھا[6]۔

توجہ کامل اور شوق طلب

اس عنوان کے ضمن میں جو واقعات آگے مذکور ہوتے ہیں اُن میں آپ

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۷۹ [2] تذ۔ ج صفحہ ۲۱۵ [3] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۶۵
[4] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۷۹ [5] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۱۰۸ [6] العقد صفحہ ۲۸۵

علمار کو زندگانی کی مختلف سختیوں میں پائینگے۔ کسی کو سرد ملک میں شب کو مسجد کے دروازے پر کھڑا دیکھینگے۔ کوئی بزرگ شدتِ گرما کے باعث پانی کے ایک بڑے ظرف میں بیٹھے ملیں گے۔ کوئی عالم آپ کو بوریئے پر دراز نظر آئینگے۔ کوئی اپنے جانی دشمن حاکم وقت کے خوف سے صحرا میں روپوش ملینگے۔ کسی کے دل میں "العشق نارٌ تحرق ماسوی المطلوب" کا جلوہ دکھائی دیگا۔ غرض مختلف گرم و سرد حالات جو ایک انسان پر گزر سکتے ہیں۔ اُن پر آپ گزرتے دیکھینگے۔ لیکن ہر حال میں آپ اُن کے دل کو اطمینان سے اپنے مطلوب یعنی علم کی طلب میں مشغول پائینگے اور واقعات ثابت کرینگے کہ یہ حوصلہ فرسا حوادث اُن کے دلوں کو علم کی جانب سے تفرقہ پیدا کرنے میں قاصر تھے۔ بعض صورتوں میں آپ دیکھینگے کہ وہ بظاہر ایک کام میں مصروف ہیں مگر قلب اُن کا علم کی جانب ہی۔ کوئی حکیم سو سو مرتبہ ایک ایک کتاب کا مطالعہ کرتا ہی۔ کسی فقیہہ کے زیر مطالعہ ایک ایک کتاب پچاس پچاس برس رہی ہی۔ ان تمام واقعات سے اُن کی توجہ کامل اور ماسوا سے بے نیازی کا پورا پتا ملے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حصول کمال کی جانب جب تک انسان اپنے دل کو پورے طور سے مائل نہ کردے کمال حاصل ہو نہیں سکتا۔ اس زمانے کے مسلمان بھی مدارس کے حجروں میں اپنی عمریں صرف کردیتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر کمال تو بڑی چیز ہی اس کا کوئی تتمہ بھی اُن میں نظر نہیں آتا۔ کوئی اس کے اسباب کچھ ہی بتائے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ صرف توجہ اور ہمت کا تفاوت ہی۔ اگر ہم وہی توجہ پیدا کریں تو وہ کمالات پھر پیدا ہو سکتے ہیں۔ آیۂ کریمہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ صاف صاف بتلا رہی ہی کہ ہر شخص اپنی اپنی کوشش کا پھل پاتا ہی۔ جو کتابیں علما کے حالات میں طبقات کے طور پر لکھی گئی ہیں اُن پر نظر غائر ڈالی جائے تو عیاں ہوتا ہی کہ جتنا طبقہ بہ طبقہ جہد طلب میں تفاوت آتا گیا اُسی قدر درجہ بدرجہ

کمالات علمیہ میں تنزل ہوتا گیا۔ سلک الدرر میں (جو بارہویں صدی کے علما کے حالات میں ایک ضخیم کتاب ہی) ایک بھی عالم پانچویں یا چھٹی صدی کے علما کے مثل نظر نہیں آتا۔ اس کے ساتھ ہی بارہویں صدی کے ایک عالم کی بھی جہد طلب پانچویں یا چھٹی صدی کے علما کی جانفشانی کے مشابہ نہیں۔ اگر ہم سلک الدرر کے کسی عالم کے حالات اُن حالات کے مثل پائیں جو ابن خلکان یا نزہتہ الالبا، کے علما کے ہیں اور پھر دیکھیں کہ ویسے کمال کو اوّل الذکر نے نہیں پایا تو بے شک ہم کو توجہ اور شوق کے سوا کسی اور سبب کے تلاش کی ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن جب ہم ہمتوں کا تفاوت پاتے ہیں تو پھر رفع الزام کے لئے اور اسباب کا پیدا کرنا روشِ حق سے بعید ہی۔

خیالِ بالا کو واقعات ذیل سے ملائیے اور اس طرح اُس کی صحت یا غلطی خود بخود منکشف ہو جائیگی۔ کمال توجہ کا اظہار فارسی کی اس مثل میں کیا گیا ہی۔ دل بیار دست بکار امام دار قطنی ایک مرتبہ ابتدائے سن میں اسمٰعیل صفّار کی مجلس املا میں حاضر تھے۔ شیخ تو املا میں مصروف تھے اور یہ ایک کتاب کی نقل کرتے جاتے تھے۔ ایک شخص اُن کی بے توجہی دیکھ کر جھنجلایا اور کہا کہ تم نقل کتاب میں مشغول ہو پھر تمھارا سماع کس طرح قابل وثوق ہو سکتا ہی۔ دار قطنی نے یہ اعتراض سُن کر کہا سماع سماع میں فرق ہوتا ہی تم تو ہمہ تن متوجہ ہو کر سن رہے ہو۔ بتلاؤ تو شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں روایت کی ہیں۔ معترض کو مجموعی تعداد کا خیال نہ تھا لہٰذا اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ دار قطنی نے کہا کہ اٹھارہ حدیثیں اس وقت تک املا ہوئی ہیں۔ پہلی کا یہ متن ہی یہ اسناد۔ دوسری کا یہ متن ہی یہ اسناد غرض اسی طرح وہ ساری حدیثیں سنا دیں۔ حاضرین اُن کا یہ ضبط دیکھ کر دنگ رہ گئے[۱]۔

---

[۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۰۰

ایک مرتبہ دو شیخ خراسان سے مکہ مکرمہ میں آئے اور حرم محترم کے دو جانب بیٹھ کر اُنھوں نے ایک ہی وقت میں روایت حدیث کی۔ دونوں کے سامعین اور مستملی جدا جدا تھے۔ حافظ کبیر اثرم دونوں کے بیچ میں بیٹھ گئے اور دونوں کا بیان برابر لکھتے رہے بے شک یہ توجہ کی یک سوئی کا کرشمہ تھا جس نے ایک سامع کو دو سامعوں کی قوت دیدی بہت سے حاضرین مجلس ایسے ہوتے ہیں کہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اُن کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا سُنا اور کم توجہی اُن کو نزدیک نابینا کا خطاب دلاتی ہے[1]۔ علی بن الحسن راوی ہیں کہ ایک شب میں نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آنے کو حضرت عبداللہ بن المبارک کے ساتھ ساتھ اُٹھا اُس رات کو سردی کی بہت شدت تھی دروازے پر پہنچ کر ابن المبارک نے ایک حدیث کا ذکر چھیڑا جب وہ فرما چکے تو میں نے اُس کی نسبت کچھ کہا میرے بعد پھر اُنھوں نے کچھ بیان کیا۔ غرض اسی طرح سلسلۂ کلام جاری تھا کہ فجر کی اذان ہوئی اور ہم دونوں مسجد کو لوٹ آئے[2]۔ حافظ حدیث حمیدی میورقی جزیرۂ میورقہ[3] میں پیدا ہوئے شام و عراق میں علم حاصل کیا اور بغداد میں آ کر رہے۔ گرمیوں میں جب شب کو لکھنے بیٹھتے اور گرمی ایذا پہنچاتی تو ایک بڑے سے ظرف میں پانی بھرتے اور اُس کے اندر بیٹھ کر لکھتے[4]۔

ابو عمرو بن العلار (امام ادب) ایک زمانے میں سفاک حجاج ابن یوسف کے خوف سے صحرائے عرب میں بھاگے پھرتے تھے۔ ادھر تو جان کے لالے پڑ رہے تھے اُدھر ایسے علامۂ ادب کو یہ تلاش تھی کہ آیا لفظ فرجہ (بمعنی گشائش) بالضم ہے یا بالفتح ایک روز اثنائے بادیہ پیمائی میں ایک قائل کو اُنھوں نے یہ شعر پڑھتے سُنا ؎

ربما تجزع النفوس من الامر ۔۔۔ فرجة کحل العقال

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۴۹ [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۵۲ [3] مجاز کا واقعہ بحیرہ روم [4] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۱۹

فرجہ کو اُس نے زبر سے ادا کیا۔ یہ شعر پڑھ کر وہ بدوی ابو العلا کی طرف مخاطب ہوا اور کہا سنتے ہو ظالم حجاج مرگیا۔ ابو العلا کہتے ہیں کہ مجھکو اُس وقت یہ تمیز نہ ہوسکا کہ آیا میں کس بات سے زیادہ خوش ہوا۔ لفظ فرجہ کی صحت ہو جانے سے یا اپنے عدوئے جانی کی خبر وفات پانے سے۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس شیفتۂ علم کے نزدیک ایک ایک علمی مسالہ جان کے برابر عزیز تھا۔ اُسی کی بدولت ابو العلا کو یہ بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ امام فن قرار پائے۔ جو لوگ اپنی جسمی آسائشوں کو بھی علم پر قربان نہ کرسکیں وہ کیا شان حاصل کرسکتے ہیں۔ اب مدرس بہت مدارس بہت لیکن شوق وہمت نایاب اس لئے ہماری علمی محفلوں میں ہر طرف سناٹا سا ہی[1]۔

ابو عبید بن سلام نے ایک بار اپنے تلامذہ سے کہا کہ میں نے چالیس برس اپنی کتاب غریب الحدیث کی تصنیف میں صرف کئے ہیں۔ اکثر فوائد مجھ کو لوگوں سے باتوں باتوں میں ہاتھ لگ جاتے تھے اور میں اُن کو موقع موقع سے اُس کتاب میں درج کرتا جاتا تھا۔ اِن فائدوں کے حاصل ہونے سے اتنی خوشی مجھ کو حاصل ہوتی کہ میں ساری ساری رات فرطِ مسرت سے جاگتا رہتا۔ تم چار پانچ مہینے بھی میرے پاس آکر رہتے ہو تو کہتے ہو کہ ہم بہت رہے[2]۔

حضرت امام زہری کا مطالعے کے وقت یہ عالم ہوتا کہ اِدھر اُدھر کتابیں ہوتیں اور اُن کے مطالعے میں ایسے مصروف ہوتے کہ دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہتی۔ بی بی کو کب گوارا ہوسکتا ہی کہ اُس کے سوا کسی اور کی اس قدر گنجائش شوہر کے دل میں ہو۔ ایک روز بگڑ کر کہا۔ واللہ لھٰذہ الکتب اشد علیّ من ثلٰث ضرائر۔ یعنی قسم ہی رب کی یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں[3]۔ امام شافعی کے جلیل القدر شاگرد امام مزنی نے

---

[1] نزہتہ۔ صفحہ ۳۲ [2] ابن۔ ج ا صفحہ ۱۹ ۱ ام [3] ابن۔ ج ا صفحہ ۵۱ ۴

اپنے اُستاد کی کتاب / رسالہ کا پچاس برس مطالعہ کیا اور وہ خود ناقل ہیں کہ ہر مرتبہ کے مطالعے میں مجھ کو نئے نئے فوائد حاصل ہوتے گئے۔[۱]

ارسطو کی کتاب النفس کا ایک نسخہ کسی کے ہاتھ لگا جس پر حکیم ابونصر فارابی کے قلم کی یہ عبارت تحریر تھی؟ انی قرأتُ ھذا الکتاب مِاۃ مّرۃٍ۔ یعنی میں نے اس کتاب کو سو مرتبہ پڑھا ہے۔[۲]

شیخ الرئیس کے مطالعے کی بھی ایک حکایت قریب قریب اس کے ہی جس کو شیخ نے خود بیان کیا ہے۔ ابن سینا کا بیان ہے کہ ایام طالب علمی میں جب میں نے کتاب ما بعد الطبیعۃ کا مطالعہ شروع کیا تو مطلقاً وہ میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ واضع فن کی کوئی غرض مفہوم ہوئی انتہا یہ ہے کہ چالیس مرتبہ میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ عبارت تو بر زبان ہو گئی لیکن مدعا نے اپنی جانب سے بالکل مایوس کر دیا ع مدعا عنقا تھا اُس کے عالم تقریر کا۔ اتفاقاً اُسی عرصے میں ایک روز عصر کے وقت کتاب فروشوں میں میرا گزر ہوا۔ وہاں ایک شخص ایک کتاب لایا اور مجھ سے کہا کہ یہ کتاب فن ما بعد الطبیعۃ میں ہے آپ لے لیجئے۔ چونکہ میں اس فن کو بے معنی خیال کر چکا تھا۔ اس لئے خریداری سے انکار کر دیا۔ دلال نے منت کی اور کہا کہ کتاب سستی ہے صرف تین درہم قیمت ہے اور مالک ضرورت مند۔ میں نے اُس کے اصرار سے مجبور ہو کر کتاب لے لی۔ خریدنے کے بعد کھول کر دیکھی تو ابونصر فارابی کی تصنیف نکلی جس میں مصنف نے اغراض کتاب ما بعد الطبیعۃ سے بحث کی تھی۔ میں خوش خوش مکان پر آیا اور اُس کے مطالعے میں مصروف ہوا۔ اصل کتاب چونکہ پہلے سے ازبر تھی اس لئے نو خرید کتاب کے پڑھتے ہی سب مشکلیں آسان ہو گئیں۔[۳]

ابو العباس ثعلب نے بغداد میں اسحٰق موصلی کے کتاب خانے میں ایک ہزار جزو فن

---

[۱] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۱ [۲] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۷ [۳] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۴

لغت کے دیکھے جو سب کے سب اسحٰق کی سماع میں آچکے تھے۔[۱]

مولانا حماد الدین رومی نے ایک رات طلبہ کے حجروں میں مخفی طور پر گشت کیا۔ ایک طالب علم کو دیکھا کہ تکیے سے لگا ہوا مطالعۂ کتاب میں مصروف ہے۔ دوسرے کو دیکھا کہ دو زانو مستعد بیٹھا ہے کتاب زیر مطالعہ ہے اور موقع موقع سے کچھ لکھتا بھی جاتا ہے یہ دیکھ کر تجربہ کار اُستاد نے اول کی نسبت کہا۔ انہ لا یبلغ درجۃ الفضل[۲] دوسرے کی نسبت فرمایا سیحصل الفضل ویکون لہ شان فی العلم[۳] تجربہ نے ثابت کر دیا کہ یہ پیشین گوئی بالکل سچی تھی[۴]۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ امام زہری ہوں یا امام مزنی حکیم فارابی ہوں یا شیخ الرئیس ان کے علمی کمالات کی اصل بنیاد یہی مطالعے کی کثرت تھی کہ ایک ایک کتاب کو سو سو بار پڑھتے تھے اور پچاس پچاس برس دیکھتے اب مطالعہ معدوم لہذا علمیت معلوم۔ بیدرد ہیں وہ لوگ جو ان بزرگوں کی جانکاہیوں کو نظر انداز کر کے اُن کے علمی کمالات کو محض اس زمانے کے آثار کا ثمرہ بتاتے اور اپنے زعم باطل میں اپنے لئے ایک عذر تراشتے ہیں۔ اگر ابو نصر یا شیخ الرئیس کی سی جانفشانی آج کل کے مسلمان کریں تو ضرور اُن کے برابر ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اگر جانفشانی کو اُن کی جانکاہی سے بڑھا دیں تو اُن سے بڑھکر ہو سکتے ہیں۔ علم و حکمت کچھ نبوت نہ تھی جو کسی ذات پر ختم ہو گئی ہو اور ہم پر یہ ایمان لانا واجب ہو گیا کہ فارابی اور شیخ کمالات علمیہ کو ختم کر گئے ے

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

ابو البرکات طبیب مشہور ابتدا میں موسوی ملت کے پیرو تھے اُس عہد کے اُستادِ طب ابو الحسن کی

---

[۱] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۹۶ [۲] یہ مرتبۂ فضیلت کو کسی طرح نہیں پہنچ سکتا [۳] یہ البتہ فاضل ہوگا اور شانِ علما حاصل کرے گا۔ [۴] شق۔ ج ۱ صفحہ ۳۵

یہ آن بھی کہ وہ منکرین حضرت مسیحا کو طب نہیں پڑھاتے تھے۔ ابوالبرکات اُن کے پاس گئے۔ لیکن ناکام واپس آئے۔ اُس طرف سے جب مایوس ہوئے تو شوق نے ایک اور راہ تبلائی۔ یعنی اُنھوں نے دربان کو ملایا اور درس کے وقت دروازے میں چھپکر بیٹھے رہنے کی اجازت لے لی ؎

نخواہم داد دربانِ ترا ہر دروں زحمت پسندست ایں کہ گاہے بینم آں دیوار بیرون را

سال بھر کامل اسی طرح باکمال اُستاد کی تعلیم کا فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک روز کسی مسئلہ میں اُلجھاؤ پڑ گیا اور کسی طرح گتھی نہ سلجھی۔ آخر چھپے رستم ابوالبرکات جسارت کرکے نکل آئے اور کہا کہ اجازت ہو تو کچھ میں بھی عرض کروں۔ اُستاد نے اجازت دی اور اُنھوں نے اُس کو جالینوس کے قول سے حل کرکے کہا کہ فلاں روز یہ قول آپ ہی نے نقل فرمایا تھا۔ ابوالحسن نے حیرت سے پوچھا کہ تم نے میرا بیان کیونکر سُنا۔ اُنھوں نے صورتِ حال گزارش کی۔ حکیم موصوف کے دل پر اُن کے شوق کا گہرا اثر پڑا اور اعتراف کیا کہ ایسے طالب کو محروم رکھنا حلال نہیں۔ چنانچہ اُسی روز ابوالبرکات کو شامل درس کر لیا۔[1]

خطیب تبریزی شارح حماسہ کو ایک کتاب لغت ابوالمنصور کی تصنیف ملی جو کئی چھوٹی چھوٹی جلدوں میں تھی۔ اُس کے مطالب حل کرنے وہ اپنے شہر کے ایک عالمِ لغت کے پاس گئے۔ عالمِ موصوف نے اُن کو یہ مشورہ دیا کہ ابوالعلاء معری کے پاس چلے جاؤ۔ خطیب نے اُن اجزاء کو ایک تھیلے میں بھر کر پشت پر ڈالا اور پیادہ پا تبریز سے مُعَرہ (واقع ملک شام قریب حماۃ) کو چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اُس کتاب کی جلدیں پسینے سے ایسی نمناک ہو گئی تھیں کہ بغداد میں لوگوں نے دیکھیں تو گمان کیا کہ پانی میں

---

[1] عیون۔ ج ا صفحہ ۲۷۹

بھیگ گئی ہیں۔ غرض اسی حال میں مَعرّہ پہنچے اور ابوالعلاء کی خدمت میں حاضر ہوکر اُس کی مشکلات حل کیں[1]۔ علامہ ابن ابی اُصیبعہ نے اپنے عم مکرم رشید الدین طبیب کی طالب علمی کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم اُس کو زمانۂ ماضی کے طرز طالب علمی اور طریقۂ کسب علوم ظاہر کرنے کے لئے یہاں نقل کرتے ہیں۔ رشید الدین نے اولاً کلام اللہ تمام ضروری مراتب کے لحاظ کے ساتھ حفظ کیا۔ حفظ کلام پاک سے فارغ ہوکر فن حساب کی تحصیل کی۔ حساب کے بعد فن طب پڑھنا شروع کیا۔ مصر کے رئیس الاطبا اُن کے والد کے دوست تھے اس لئے رشید الدین کو اُنھوں نے خود طب شروع کرائی اور جالینوس کے سولہ رسالے پڑھائے۔ جن میں سے چند ابتدائی لفظ بہ لفظ حفظ کئے گئے۔ ان رسالوں کو رئیس الاطبا سے پڑھ کر اور اساتذۂ فن سے سبق لینے لگے۔ نری کتاب خوانی پر قناعت نہ تھی بلکہ سبق سے فارغ ہوکر بیمارستان (شفا خانہ) جاتے اور وہاں کے مریضوں کو دیکھکر معالج اطبا نے جو مرض تشخیص اور علاج تجویز کیا ہوتا اُس کو سنتے۔ اسی ضمن میں فن کحالی (آنکھ بنانا) سیکھا اور اُس کا عمل نفیس الدین سے (جو بیمارستان میں اسی صیغے کے افسر اعلیٰ تھے) حاصل کیا اور جراحی کی مشق بھی شفاخانۂ مذکورہ میں کی۔ فن طب کے ان مشاغل کے ساتھ اور علوم سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ ادب اور فلسفہ عبداللطیف بغدادی سے اور منطق کا ایک سبق علوم حکمیہ کے اُستاد سدید الدین منطقی سے پڑھتے۔ ابو محمد جعفری سے فن نجوم اور ابن الدیحور سے فن موسیقی حاصل کرتے۔ بیس برس کی عمر میں شام پہنچکر اُنھوں نے مطب شروع کردیا۔ بااین ہمہ طب رضی الدین سے پڑھتے رہے اور وہاں کے مشہور اُدبا سے ادب۔ اتفاقاً اُن کے اُستاد عبداللطیف بغدادی بھی وہاں پہنچ گئے تو اُن سے

---

[1] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۳۳

فلسفے کا مشغلہ پھر جاری کر دیا۔ اس جانفشانی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہنوز اُن کا سن پچیس برس کا نہوا تھا کہ طب میں اُن کو نمود حاصل ہو چلی اور مذکورۂ بالا علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ علاوہ ان علوم کے رشید الدین زبان ترکی اور فارسی میں بھی ماہر تھے۔ بلکہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ حکایت بالا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگلے اطبا اس فن شریف کے تمام شعبے حاصل کرتے تھے اور آج کل کے اطبا کی طرح اُن کا علاج دوسروں کے بھروسے پر نہیں چلتا تھا[۱]۔ امام طبرانی کی وسعت معلومات دیکھ کر ایک شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کا علمی خزانہ اس قدر بالا مال کیوں کر ہوا؟ تو امام ممدوح نے فرمایا کہ جانِ عزیز تیس برس میری کمر نے بوریے کے سوا اور کسی بستر کا لطف نہیں اُٹھایا[۲]۔

امام ادب ثعلب ناقل ہیں کہ پچاس برس سے برابر میں ابراہیم حربی کو اپنی سر مجلس لغت و ادب میں موجود پاتا ہوں[۳]۔ امام رازی کو تاسف ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت کیوں علمی مشاغل سے خالی جاتا ہے۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ واللہ انی اتاسف فی الفوات عن الاشتغال بالعلم فی وقت الاکل فان الوقت والزمان عزیز۔ یعنی خدا کی قسم مجکو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس آتا ہے کیونکہ فرصتِ وقت بہت عزیز چیز ہے ؎

در بزمِ وصالِ تو بہنگامِ تماشا   نظارہ ز جنبیدنِ مژگان گلہ دارد

امام رازی اگر اوقات کو عزیز نہ سمجھتے تو نہ اُن پر علوم کے راز کھلتے اور نہ اُن کو کوئی امام کہتا[۴]۔ محویت شوق کا یہ لطیفہ بھی قابل سننے کے ہے کہ ادیب مشہور ابو محمد اعرابی اپنے چہرے پر روغن مل کر آفتاب کے سامنے بیٹھا کرتے تھے تاکہ اُن کا رنگ بدویوں کی طرح کالا ہو جائے اور اعرابی کا لقب ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے اُن پر صادق ہو۔ چنانچہ میدان

---

[۱] عیون ج ۲ صفحہ ۲۴۸۔ [۲] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۱۱۸۔ [۳] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۶۲۔ [۴] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۲۳

طلب میں اُن کو یہ سرخ روئی حاصل ہوئی کہ اسود کا خطاب مل گیا اور آج تک اسی لقب سے وہ تاریخ میں مشہور ہیں۔ فدائیانِ شوق کا یہ بھی ایک رنگ ہے[1]۔ مولانا خسرو سلطان محمد خاں فاتح قسطنطنیہ کے وقت میں نہایت باوقار اور عہدۂ قضا پر ممتاز تھے۔ اگرچہ بہت سے خدام ان کی خدمت میں تھے تاہم مطالعے کے کمرے میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے چراغ روشن کرتے اور آتش خانے میں آگ سلگاتے[2]۔ اسحٰق بن سلیمان طبیب سو برس کے ہو کر فوت ہوئے اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اور نہ مدت العمر اُنھوں نے شادی کی۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ کسی نے اُن سے پوچھا کہ آپ کے دل میں اولاد کی تمنا ہے۔ تو اُس دانا حکیم نے جواب دیا کہ اپنی کتاب حمیات کے ہوتے ہوئے اولاد نہ ہونے کا کبھی خیال بھی مجھ کو نہیں آتا[3]۔

امام یحییٰ ناقل مؤطا مدینہ منورہ میں ایک روز امام مالک کے درس میں حاضر تھے کہ غوغا ہوا کہ ہاتھی آیا۔ عرب میں ہاتھی عجوبہ چیز ہے اس آواز کے سنتے ہی سارے طلبہ درس چھوڑ کر بھاگ اُٹھے مگر یحییٰ اُسی طرح اطمینان سے بیٹھے رہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یحییٰ! تمھارے ملک اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی جا کر دیکھ آؤ۔ اُن کے دل میں اور ہی خیال بس رہا تھا۔ جواب دیا کہ حضرت! اندلس سے میں آپ کو دیکھنے اور علم سیکھنے آیا ہوں ہاتھی دیکھنے کے واسطے بے خانماں نہیں ہوا[4]۔

بہ نسبت دیدۂ مجنوں زخویش و بیگانہ چہ آشنا نگہے بود چشمِ لیلیٰ را

ابوبکر بن بشار ادب کے مشہور امام بغداد میں شاہزادوں کے اتالیق تھے۔ ایک روز قصر خلافت کو جاتے ہوئے نخاس سے گزرے وہاں اُن دنوں ایک جاریہ آئی ہوئی تھی جس کے حسن اور سلیقے کا سارے بغداد میں شہرہ تھا۔ ابن بشار اُس کو دیکھ کر مفتوں ہو گئے۔ جب دارالخلافہ میں پہنچے تو خلیفہ نے پوچھا کہ آج دیر میں کیوں آئے۔ اُنھوں نے ماجرا عرض کیا۔ یہ سن کر خلیفہ نے

---

۱ نزہتہ۔ صفحہ ۲۴۳ ۲ شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۶ ۳ عیون۔ ج۔ صفحہ ۳۰ ۴ ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۶

درپردہ خدام کو حکم دیا کہ وہ جاریہ خرید کر ابن بشار کے مکان پر اُن کے پہنچنے سے پہلے پہنچادی جائے۔ جب علامہ ممدوح مکان پر واپس آئے تو جاریہ کو بیٹھا پایا۔ دریافت کیا تو حال معلوم ہوا۔ اُس کو تو اُنھوں نے بالاخانے پر بھیجدیا اور خود وہیں بیٹھ کر ایک علمی مسائے پر (جس کی تحقیقات میں وہ اُن روزوں مصروف تھے) غور کرنے لگے طبیعت تو ادہر ہی طرف لگ رہی تھی اُلجھنے لگے۔ قلب کا یہ رنگ دیکھکر ابن بشار نے خادم کو آواز دی اور کہا کہ اس شہر آشوب کو لے جاکر واپس کرآؤ۔ میرے دل میں اُس کی اتنی قدر نہیں ہے کہ میرے خیال کو علم سے پھیرے۔ چنانچہ خادم گیا اور جاریہ کو واپس کر آیا۔[1]

حفظ و استحضار علمی یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ علم سینہ بہ از علم سفینہ۔ علما کا ایک دور تھا جب کتاب کا وجود بھی مسلمانوں میں نہ تھا۔ جو کچھ اُستادوں سے پڑھتے اور سیکھتے صفحۂ حافظہ پر ثبت کرنا پڑتا۔ یہاں تک کہ کاغذ و قلم کی مدد کو وہ عار سمجھتے تھے چنانچہ بعض علمائے سلف فخریہ بیان کرتے کہ ہم نے کبھی سپیدی پر سیاہی کے دھبے نہیں ڈالے۔ گویا اُن کے دماغ کتاب خانے تھے جن میں علمی مسائل خوبی اور خوش اسلوبی سے چنے ہوئے تھے۔ اسی قوتِ حافظہ کی وجہ سے اُس زمانے میں تعلیم کا طریقہ املا کے طرز پر تھا۔ حق یہ ہے کہ جیسے اساتذۂ فن اس روش تعلیم نے پیدا کئے وہ کتاب خوانی سے پیدا نہ ہو سکے۔ جتنے فن آج اسلام میں مدوّن ہیں اُن کے رؤسا و کملا اُس عصر میں ملیں گے جب طریقۂ املا رائج تھا متاخرین کا سرمایۂ فخر حاشیہ و شرح نویسی ہے متقدمین کو مجتہدانہ قوت پر ناز تھا اُن بزرگوں کے حفظ و استحضار علمی کے واقعات دیکھکر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیسی شاقہ محنتیں وہ علوم کی تحصیل میں برداشت کرتے ہونگے۔ اُن حکایتوں پر اپنی حالت کو

[1] نزہتہ - صفحہ ۳۳۶۔

قیاس کرکے بدگمانی کی نظر ڈالنا آئینِ حق سے بعید ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے تمام قویٰ مشق اور کثرتِ کار سے ترقی کرتے ہیں اور ترقی کی کوئی حد معیّن نہیں آیندہ دورانِ بیان میں آپ کو ایسی حکایتیں ملیں گی جن کو معتبر مورخین نے چشم دیدہ لکھا ہے یا دوسری عینی شہادت کو نقل کیا ہے۔ بعض ائمہ ثقات نے اپنے حالات خود نقل کئے ہیں۔ ان حالتوں میں میری رائے ناقص میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بہت کم رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ کتابیں تصنیف ہوئیں اُن پر اعتماد بڑھا اور قوت حافظہ بیکاری کی وجہ سے مضمحل ہوتی گئی جو علم متقدمین کے دماغوں میں تھا وہ متاخرین کے کتاب خانوں میں آکر ٹھیرا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگلوں کے حالات پچھلوں کے قیاس سے بھی باہر معلوم ہونے لگے۔

غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ متقدمین کی قوت علمیہ کو ان تین ذرائع سے بہت مدد ملتی تھی۔ اولاً حفظ۔ ثانیاً کتابوں کا اپنے ہاتھ سے لکھنا۔ ثالثاً کثرت مطالعہ۔ متاخرین سے رفتہ رفتہ یہ سب سلب ہوگئے۔ حفظ کو کتابوں کی تصنیف نے باطل کردیا اور تحریر کتابوں کی کثرت سے فضول ہوگئی اور اس زمانے میں جب کہ مطابع کتابوں کے وجود سے دنیا کو مالامال کررہے ہیں۔ کتابوں کی نقل کرنی تضیع اوقات سے زائد نہیں خیال کی جاسکتی۔ ایک مطالعہ باقی تھا اُس کو ہمارے زمانے میں اُس طرز تحشیے نے بالکل غارت کردیا جو اب بدقسمتی سے رائج ہوگیا ہے۔ ضمائر کے مرجعے۔ اشاروں کے مشارٌ الیہ ہندسوں کی مدد سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ قریباً ہر ہر لفظ پر حاشیہ بلکہ حواشی نقل کئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ ان کتابوں کو خرید کر نہ مطالعہ کی محنتِ شاقہ اٹھاتے ہیں نہ اساتذہ کی تقریروں کو پورے طور سے قابو میں کرتے ہیں۔ اسی اعتماد نے کہ ہماری کتاب میں سب کچھ لکھا ہے جب ضرورت ہوگی دیکھ لینگے دماغی قوت کا بالکل ستیاناس کردیا۔

مجھ سے اس عہد کے ایک مشہور فاضل نے طالب علمی کا ایک قصہ بیان کیا کہ میر زاہد

رسالہ پڑھنے کے وقت ہمارا یہ عالم تھا کہ جو جو رموز اور نکات اُستاد کی زبان سے نکلتے ہماری یہ کوشش ہوتی کہ دماغوں میں نقش ہو جائیں. کیوں کہ اگر اُستاد کی زبان سے نکل کر دماغوں میں نہ ٹھیرتے تو پھر کہاں ملتے. غرض پڑھتے وقت اُستاد کے بیانوں کو پوری توجہ سے سُن کر خیال میں رکھتے. درس سے فارغ ہو کر اُن کا خلاصہ لکھتے اور لکھے ہوئے کو یاد کرتے اُنھیں دنوں میں لکھنؤ یا کانپور سے رسالۂ مذکور محشّیٰ ہو کر نکلا اور نکلتے نکلتے مدارس میں پھیلا اُس کے خریدتے ہی طلبہ کی ہمت میں قصور آگیا اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ جو اُستاد کی زبان پر ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے. پھر جانفشانی بے کار ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں سب کچھ تھا مگر اُن کے دماغوں میں کچھ بھی نہ آیا. جو کتابیں اگلے اساتذہ کو دیکھنے کو نہ ملتی تھیں آج وہ دکانوں میں بھری پڑی ہیں. لیکن علم کا قحط ہے.

امام ابو عیسیٰ ترمذی مصنف جامع ترمذی (جو صحاح ستہ میں شامل ہے) فرماتے ہیں کہ میں نے دو جز ایک شیخ کے روایت کردہ احادیث کے لکھے تھے. حسن اتفاق اُسی عرصہ میں خود وہ شیخ مجھ کو مل گئے. میں نے احادیث مذکورہ کی اجازت طلب کی اور اُنھوں نے میری استدعا قبول فرما کر اُن احادیث کو سنانا شروع کر دیا. مجھ کو خیال تھا کہ مذکورۂ بالا دونوں جز میرے پاس ہیں. اب جو دیکھتا ہوں تو بجائے اُن کے دو سادے جز میں نے غلطی سے رکھ لیے تھے مجھ سے سوائے اس کے کچھ نہ بن پڑا کہ وہی سادے جزہات میں لے کر شیخ کی حدیثیں سننے لگا. سوءِ اتفاق سے شیخ کی نظر اُن اوراق پر پڑ گئی اور بگڑ کر کہا کہ تم کو مجھ سے شرم نہیں آتی میں نے اصلی ماجرا بیان کیا اور کہا کہ جو حدیث آپ سناتے ہیں مجھ کو یاد ہوتی جاتی ہے. ابو عبیدہ نے شیخ کو میرے قول کا اعتبار نہ آیا اور فرمایا سناؤ. میں نے سب سنی ہوئی ہیں کہ کبھی کتاب کو سنادیں. اُن کا شبہ اب بھی نہ گیا. اور کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ حدیثیں

پہلے تم حفظ کر چکے تھے۔ میں نے گزارش کی کہ اور نئی حدیثیں بطور امتحان روایت فرمائیے۔ چنانچہ چالیس حدیثیں اُنھوں نے نئی سنائیں اُن کو بھی میں نے فوراً دہرادیا اور ایک بھی غلطی نہیں کی۔ واقعۂ بالا سے معلوم ہوتا ہی کہ کثرتِ مشق اُن کے حافظہ کی قوت کو کیسا بڑہا دیتی تھی کہ غور سے سننا اور حفظ ہوجانا یہ دونوں عمل اُن کے واسطے ایک ہو گئے تھے داؤد ابن سمعہ نے ایک بار کہا کہ لوگ حفظ کے بارے میں ابو حاتم رازی اور ابو زرعہ کی نظیر دیا کرتے ہیں۔ میں نے واللہ قرطمہ سے بڑھکر کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کتابوں میں سے جس کو چاہو اُٹھالو میں حفظ سنادونگا۔ میں نے امتحاناً ایک کتاب اُٹھا کر کہا۔ کتاب الاشربہ۔ میں نے اتنی تحریک کی تھی کہ اُن کی قوتِ حافظہ کا چشمہ رواں ہوگیا اور ساری کتاب سنا ڈالی۔

خطیب بغدادی اپنی تاریخ بغداد میں لکھتے ہیں کہ ادیب مشہور ابو عمرو زاہد۔ قاضی محمد کے صاحبزادے کو ادب کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک روز اُنھوں نے اپنے شاگرد کو لغت کے تیس مسئلے اور اُن کے آخر میں دو شعر لکھوائے اتفاقاً اُسی دن عہد مذکور کے تین اُستاد کامل ابن دُرید۔ ابن انباری اور ابو بکر۔ قاضی ممدوح سے ملنے آئے (کثرت بیان کی وجہ سے بعض لوگ ابو عمرو کی نسبت یہ بدگمانی کرنے لگے تھے کہ وہ بہت سی باتیں طبعزاد بھی کہہ دیتے ہیں [illegible] قاضی صاحب نے وہ مسائل علمائے موصوف کی خدمت میں پیش کئے اور اُن کی محنتِ شاقہ اُٹھ [illegible] علامۂ وقت کے مسائل پر رائے زنی کرنا پوری ذمہ داری کا کام تھا نے کہ ہماری کتاب میں لوبکر تو اپنے مشاغل کا عذر کر کے خاموش ہو رہے۔ ابن دُرید نے بیساختہ مجھ سے ابن عمہ کے

؁ تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۹

کہا کہ ان مسائل کی لغت میں کوئی اصل نہیں۔ سب ابو عمرو کے گڑھے ہوئے ہیں ابو عمرو کو خبر پہنچی تو قاضی صاحب سے کہلا بھیجا کہ اپنے کتاب خانے میں سے فلاں فلاں شعرائے عرب کے دیوان نکلوا دیجئے۔ چنانچہ وہ سب دیوان نکالے گئے۔ ابو عمرو نے ایک ایک مسئلہ لے کر اُس کے شواہد اُن دیوانوں سے نکال نکال کر قاضی صاحب کو دکھلانے شروع کئے اور اس طرح تیسوں مسائل اہل زبان کے کلام سے ثابت کر دیئے۔ دو شعر جو اخیر میں لکھوا دیئے اُن کی نسبت کہا کہ میرے اُستاد ثعلب نے فلاں روز آپ کے سامنے پڑھے تھے اور آپ نے فلاں کتاب کی پشت پر لکھ لئے ہیں۔ جب وہ کتاب دیکھی گئی تو فی الواقع وہ شعر اس پر ثبت تھے۔ ابن دُرید نے اس حال کو سُن کر پھر کبھی کوئی لفظ ابو عمرو کی نسبت زبان سے نہیں نکالا۔[1]

متنبی شاعر مشہور سے ابو علی فارسی امام نحو نے ایک بار پوچھا کہ فِعلیٰ کے وزن پر عربی زبان میں کتنے اسم جمع آئے ہیں۔ متنبی نے بے تامل کہا حِجلیٰ اور ظِربیٰ۔ ابو علی نے تین شب متواتر لغت کی کتابیں چھانیں مگر تیسرا اسم جمع اُن کو اس وزن کا نہ ملا۔[2]

جب حسن ابن سہل وزیر خلیفہ مامون الرشید عراق میں آیا تو اُس نے علمائے ادب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی حسب الایما اصمعی، ابو عبیدہ اور ابو بکر نحوی۔ بارگاہ وزارت میں حاضر ہوئے۔ اُن سے مخاطب ہونے سے پیشتر وزیر نے اُن عرائض پر دستخط کئے جو اہل حاجت نے پیش کی تھیں۔ جب ان عرضیوں پر جو شمار میں پچاس تھیں دستخط کر چکا تو علمائے ممدوح کی طرف متوجہ ہو کر معذرت کی اور سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اثنائے کلام میں اُن بزرگانِ گزشتہ کا ذکر ہوا جن کی قوتِ حافظہ مشہور تھی اور امام زہری اور قتادہ کا ذکر ہونے لگا۔ ابو عبیدہ نے کہا حدیثِ زندہ گویم مردہ در گور۔ اس وقت یہاں ایسا شخص موجود ہے کہ کبھی کتاب کو

---

[1] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۹۱۔ [2] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۶

ایک بار پڑھ کر دوبارہ دیکھنے کی اُس کو حاجت نہیں ہوئی اور جو بات ایک دفعہ اُس کے خزانۂ حافظہ میں پہنچ گئی پھر نہیں نکلی یہ سُن کر اصمعی نے جسارت کرکے کہا کہ یہ میری طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اُن کے دعوے کو میں اس طرح ثابت کرسکتا ہوں کہ وزارت مآب نے جس قدر عرائض پر اس وقت دستخط فرمائے ہیں اُن سب کا خلاصۂ مضمون اور دستخطوں کی اصل عبارت سنا دوں۔ وزیر کے حکم سے کُل عرضیاں واپس آکر پیش ہوئیں۔ اصمعی نے بیان کرنا شروع کیا کہ فلاں عرضی کے پیش کنندہ کا یہ نام ہے اور یہ کام اور یہ دستخط اس پر ہوئے۔ اسی طرح وہ نادرہ روزگار بیان کرتا گیا۔ جب کچھ اوپر چالیس عرضیوں کی نوبت پہنچی تو حاضرین میں سے ابو نصر نے کہا کہ اصمعی خدا کے لئے اپنی جان پر رحم کرو کہیں نظر نہ لگ جائے۔ یہ سُن کر وہ چہکتا ہوا بلبل خاموش ہوگیا۔[۱]

امام ابوسعد کو ساری صحیح مسلم۔ حافظ ابو الحسین اصفہانی کو صحیح بخاری و صحیح مسلم اور امام تقی الدین بعلبکی کو الجمع بین الصحیحین صحیح مسلم اور اکثر مسند امام احمدؒ بر زبان تھی امام آخر الذکر ایک جلسے میں ستر حدیثیں حفظ کرلیتے تھے۔ ایک بار ایک دن سے کم میں انھوں نے مقامات حریری کے تین مقامے ازبر کرلئے۔[۲] علامہ ابن ابی اصیبعہ مؤلف طبقات الاطبا نے ادویۂ مفردہ کے متعلق کچھ کتابیں مصنفۂ ابن بیطار خود مصنف سے پڑھی تھیں۔ اپنے اُستاد کی تعلیم کا جو اسلوب اُنھوں نے طبقات میں لکھا ہے اُس سے علاوہ استحضار علمی کے یہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ اساتذۂ سلف کس طرح اپنے تلامذہ کو کامل بناتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے اُستاد کے درس کے وقت بہت سی کتابیں، مفرد دواؤں کے متعلق مثل کتاب حکیم دیسقوریدس، کتاب جالینوس، کتاب غافقی موجود رہتیں۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا

---

[۱] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۲۶ [۲] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۸۰۔ ۱۱۲۔ ۲۳۱۔

کہ اول ایک مفرد دوا کا یونانی نام (جو دِیسقوریدس نے لکھا ہی) لیتے اُس کے بعد اُس کے معنی (جو اُنھوں نے روم میں رہ کر تحقیق کیے تھے) بیان کرتے۔ پھر جو کچھ طبیب مذکور نے اُس دوا کے افعال و خواص لکھے ہیں سُناتے۔ اسی طرح جالینوس اور متاخرین کے اقوال و مذاہب کا بہ ترتیب ذکر کرتے پھر اطبا کے باہمی اختلاف کی (دوائے مذکور کی نسبت) تشریح کرتے۔ آخر میں وہ غلطیاں ظاہر کرتے جو اطبائے مذکورسے اُس دوا کے متعلق سرزد ہوئی تھیں۔ اُستاد جب ان مدارج کو طے کر چکتے تو ہم محوّلہ کتابوں کو کھول کر دیکھتے۔ اُن کے زبانی بیان اور کتابوں کے مضمون میں سرِمو فرق نہ نکلتا۔ جب ہم کتاب دیکھتے تو ابن بیطار یہ بتلاتے جاتے کہ دلیسقوریدس نے فلاں مقالے میں اس دوا کا ذکر کیا ہی اور مقالۂ مذکور میں اس کا یہ نمبر ہی اس قدر بیان پر علامہ اُستاد کو تسلی نہ ہوتی بلکہ جن نباتات کا ذکر درس میں ہوتا وقتاً فوقتاً جنگل میں لے جا کر اُن کا مشاہدہ بھی طلبہ کو کرا دیتے۔ جو اُستاد اپنے طلبہ کے سامنے بقراط اور جالینوس کی غلطیاں نکال کر رکھدے اُن کو کتاب کا کیڑا نہ بنائے بلکہ حقائق کے مشاہدے کا خوگر کرے اُس کے شاگرد بے شک کامل اور محقق ہونگے۔ جو لوگ جالینوس اور ارسطو کی عقل کو معصوم مان چکے اُنھوں نے تو گویا اپنی عقلوں کو یونانیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا پھر کمال کیسا اور تحقیقات کجا۔[1]

امام داؤد ظاہری ناقل ہیں کہ میری محفل میں ایک روز ایک شخص ابو یعقوب بصری نامی شکستہ حال وارد ہوئے اور بدون کسی اشارے کے خود بخود صدر میں آ بیٹھے اور فخریہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ سل یا فتی عما بدالک (اے جوان تیرے دل میں جو آئے مجھ سے پوچھ لے) مجھ کو اُن کی اس مشیخت پر سخت غصہ آیا اور استہزاءً میں نے کہا کہ حجامت[2]

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳۔ [2] پچھنے لگوانا

کی نسبت کچھ فرمائیے۔ ابو یعقوب نے بارک اللہ کہا اور سب سے اول محدثانہ اور فقیہانہ گفتگو شروع کی۔ حدیث افطر الحاجم والمحجوم روایت کرکے بیان کیا کہ کس راوی نے اس کو مسند اور کس نے موقوف اور کس نے مرسل روایت کیا ہے اور فقہا میں کس کس کا عمل اس پر ہے اس کے بعد انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنے لگوانے کے مختلف طریقے بیان کئے اور اُس اُجرت کا ذکر کیا جو آپ نے حجام کو مرحمت فرمائی تھی اور یہ ثابت کیا کہ اگر اُجرتِ حجامت حرام ہوتی تو آپ مرحمت نہ فرماتے۔ پھر ایک اور حدیث کے طرق روایت سُنائے جس کا مضمون یہ ہے کہ آں حضرت نے بھری شاخیں کھچوائی تھیں۔ پھر اس باب کی تمام احادیث صحیحہ متوسطہ اور ضعیفہ کو علی الترتیب بیان کیا۔ اصول حدیث و فقہ کے مطابق اس قدر بحث کے بعد وہ طب کی طرف جھکے اور اطبا کی جو رائے حجامت کی نسبت مختلف زمانوں میں رہی ہے مشرح کہہ سنائی۔ طب کے بعد تاریخ کا نمبر تھا آخر کلام میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ سب سے اول یہ عمل اصفہان میں ایجاد ہوا تھا۔ امام ظاہری فرماتے ہیں کہ میں یہ وسعتِ تقریر دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اور ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا واللہ ما حقرت بعدک احدًا ابدًا یعنی میں بعد تمھارے کسی کو بہ نظر حقارت نہیں دیکھوں گا[1]۔ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس نے ایک زمانے میں بیان کیا تھا کہ میں جب تک دو سو سطریں حفظ نہیں کرلیتا سوتا نہیں۔

قرامان واقع ملک روم میں جو مدرسہ بنام سلسلہ جاری تھا اُس کے بانی کی جانب سے یہ شرط تھی کہ اُس کا مدرس وہ عالم مقرر کیا جائے جس کو صحاح جوہری ازبر ہو۔ چنانچہ مولانا جمال الدین اپنے عہد میں مدرسۂ مذکور کے مدرس تھے[2]۔

علامہ ابن العلا سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آدمی کو کب تک	علم سے سیر نہ ہونا

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۰۶ [2] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۹۳

علم حاصل کرنا چاہیئے۔ اُس عالی دماغ نے جواب میں کہا کہ مادامت الحیٰوۃ تحسن بہ یعنی جب تک حیات مہربان رہے۔ دریائے علم ناپیداکنار ہی اور انسانی زندگی محدود با ایں ہمہ اگر آدمی کسی حد پہ پہنچ کر علم سے سیر ہو جائے تو یہ اُس کی حرمان نصیبی ہی۔ شوق کا تقاضا یہ ہی ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

اور یہ محض دل خوش کن خیال نہیں ہی۔ آپ میدانِ علم میں ایسے جوان مرد پائینگے جنھوں نے اس قول کو دم واپسیں تک عزیز رکھا اور دکھلا دیا کہ جب اجل کا فرشتہ اُن کی جانِ شیریں تن سے جدا کر رہا تھا وہ علم کی خدمت میں مشغول تھے اور سچ یہ ہی کہ جب علم محدود نہیں تو طلب کی بھی کوئی حد نہ ہونی چاہیئے۔ کسی کمال کے طالب کا یہ خیال کر لینا کہ میں حد طلب کو پہنچ چکا سم قاتل ہی۔ یہ مسالہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہی کہ عالم میں کسی حالت کو وقوف نہیں ہی۔ یا ترقی ہی یا تنزل۔ پس علمی عروج میں بھی جب زینے پر طالب کا قدم رُکا وہیں سے اُس کا تنزل شروع ہو جائیگا اور جب تک اُس کے ذہن میں اپنی نادانی کا خیال راسخ اور اُس کی ہمت کا مقولہ ”پیش“ رہیگا۔ میدانِ طلب میں فتح و فیروزی نصیب ہوتی جائیگی۔ سقراط کا مقولہ ہی کہ میرے علم کی معراج یہ ہی کہ میں نے سمجھ لیا ہی کہ مجھ کو کچھ نہیں آتا۔ دیار مغرب کا ایک حکیم دانا جب بستر نزع پر دم توڑ رہا تھا تو اُس نے کہا کہ دنیا میرے علم کی نسبت معلوم نہیں کیا کیا گمان کر رہی ہوگی مگر میں اپنے آپ کو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک نافہم بچہ سمندر کنارے چند خزف پاروں سے کھیل رہا ہی اور علم کا ناپیداکنار سمندر اُس کے سامنے موج زن ہی۔ بیشک اگر ان حکما کا یہ دلی عقیدہ نہ ہوتا تو ہرگز وہ علمی مراتب پر سرفراز نہ ہوتے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

امام ابن السنی کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ایک روز لکھتے لکھتے

قلم دوات میں رکھا اور دعا کو ہات اُٹھائے۔ جو ہات دعا کے واسطے اُٹھے تھے پھر وہ قلم نہ اُٹھا سکے اور عین حالت دعا میں روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ ابن السنی کا سن اُس وقت اسی برس سے متجاوز ہو چکا تھا[۱]۔ حافظ ابن مندہ کا بیان ہی کہ اُن کے والد جب دُنیا سے رحلت کر رہے تھے تو حافظ ساجی اُن کے سامنے غرائب شعبہ کی قرأت میں مصروف تھے[۲]۔ امام ادب ابو العباس ثعلب کی وفات کے واقعے سے زیادہ موثر مثال اس مبحث میں مشکل سے ملیگی۔ ثعلب کی عمر اکانوے برس کی ہو چکی تھی کہ ایک دن جمعے کے بعد مسجد سے مکان کو جانے لگے راستے میں کتاب دیکھتے جاتے تھے۔ کتاب میں محویت اور اُس پر ثقل سماعت پھر آواز کیا سنتے ایک گھوڑے کا دھکا لگا اور اُس کے صدمے سے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے لوگ غشی کی حالت میں اُٹھا کر مکان پر لائے ضعیف پیری اتنے بڑے صدمے کو کب برداشت کر سکتا تھا اُسی حال میں رحلت کی۔ انتہائے پیری میں بھی اُن کا شوقِ طلب اتنا قوی تھا کہ رہ نوردی میں جو وقت گزرتا اُس کا جاتا رہنا بھی گوارا نہ ہوا[۳]

چہ حالت ست ندانم جمالِ سلمارا	کہ بیش دیدنش افزوں کند تمنا را

اور سچ یہ ہی کہ اگر یہ علمی تشنگی نہ ہوتی تو ابو العباس ادب میں امامت کے درجے کو نہ پہنچتے۔ انسان جب کسی پریشانی میں ہوتا ہی تو اُس سے معمولی کام بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن طلب صادق میں یہ کرامات ہی کہ وہ پریشانی کو بھی جمعیت کے قالب میں لے آتی ہی۔ علمائے سلف نے پریشان خاطری کی حالت میں وہ وہ کام کئے ہیں کہ زمانہ آج تک اُن پر آفریں کر رہا ہی۔ ابو تمام طائی شاعر مشہور ایک مرتبہ خراسان کے دربار کو جا رہا تھا۔ ہمدان پہنچ کر موسم سرد مہری سے پیش آیا اور برف اس کثرت سے پڑی کہ تمام راستے بند ہو گئے اور ابو تمام کو چندے وہیں قیام کرنا پڑا۔ حارث

---

[۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۵۱ [۲] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۴۴ [۳] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۰

سفر میں ایسا حرج واقع ہونے سے جو پریشانی طبیعت کو ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مگر ہمارے زندہ دل شاعر کی خاطر جمع تھی جس رئیس کا وہ مہمان تھا۔ اُس کے کتاب خانے میں دواوین عرب بکثرت تھے ابو تمام نے موقع کو غنیمت سمجھ کر سب دیوان پڑھے اور اُن میں سے اشعار انتخاب کر کے نظم عربی کا ایک بے بہا مجموعہ تیار کر لیا جو آج تک حماسہ کے نام سے سارے عالم میں مشہور ہے۔[1]

شیخ الرئیس سے ایک زمانے میں حکام وقت برہم تھے اور جان کے خوف نے اُس کو روپوش کر رکھا تھا اسی تباہ حالی میں کچھ دن کے لئے اُسے ایک عطار کے گھر میں پناہ مل گئی۔ اتنا سا اطمینان پاکر شیخ کو اپنے علمی مشاغل یاد آئے اور عطار سے سامانِ تحریر منگوا کر تصنیف شروع کر دی۔ یہ کوئی معمولی تصنیف نہ تھی بلکہ شیخ اپنی کتاب شفا کو تمام کر رہا تھا۔ طرز تصنیف یہ تھا کہ اول رؤس مسائل اپنی یاد سے ایک جز پر لکھے اُس کے بعد اُن مسائل کی تشریح کی۔ اس طرح فن طبعیات والٰہیات ختم کر دیئے۔ فنون حکمیہ میں کتاب حیوان و کتاب نبات اگرچہ باقی تھی لیکن شیخ اُن کو چھوڑ کر فنِ منطق لکھنے لگا۔ ہنوز منطق تحریر ہو رہی تھی کہ قضیہ دگرگوں ہو گیا کسی مخبر نے حاکم کو خبر کر دی اور اُس نے شیخ کو گرفتار کر کے قلعۂ فردجان میں بھیج دیا۔ اُس بلند اور استوار حصار میں شیخ کا جسم بے شک مقید تھا۔ لیکن اُس کے علمی شوق کو کوئی دنیاوی طاقت مقید نہیں کر سکتی تھی۔ اُسی زندان میں کتاب ہدایات رسالہ حی ابن یقظان اور کتاب القولنج تصنیف کر ڈالیں۔ اُس وقت کے لوگ اگلے زمانے کو ایک بہشتی زمانہ تصور کر رہے ہیں جس میں علما کے واسطے در و دیوار اور زمین و آسمان سے اطمینان و فارغ البالی برستی تھی اور اُن کا یہ گمان بلکہ بدگمانی ہے کہ جو نمایاں کام اسلاف نے کئے وہ اسی فراغ خاطر کی بدولت تھے۔ حال آنکہ واقعات اس کی تردید کر رہے ہیں۔ کیا حکایت بالا کو پڑھ کر کسی

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۶۱

دل میں یہ تمنا پیدا ہوگی کہ کاش اُس کو شیخ الرئیس کا سا اطمینان نصیب ہوتا۔ اگر شیخ نجات اور فراغ خاطر کا منتظر رہتا تو دنیا کو شفا وغیرہ بے بہا تصانیف کب میسر آتیں۔[1] شیخ ابن جوزی ایک زمانے میں واسط میں نظربند تھے یہ وہ وقت تھا کہ چار دانگ عالم کو اُن کی امامت و جلالت مسخر کر چکی تھی حسن اتفاق سے ابن باقلانی بھی اُن روزوں واسط میں تھے۔ ابن جوزی نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اُن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ شیخ کے صاحبزادے یوسف باپ کے ہم سبق تھے۔ اس واقعہ کی جان یہ ہے کہ سبق خوانی کے وقت امام ابن جوزی کی عمر اسّی برس کی تھی۔[2] شمس الائمہ سرخسی نے جو کتاب علم اصول میں تصنیف کی ہے اُس کا لکھنا خوارزم کے قید خانے میں شروع کیا تھا۔ باب الشروط تک حالت قید میں لکھی۔ رہائی پا کر فرغانہ میں ختم کی۔[3]

علامہ اثیر الدین ابہری کی نسبت بیان ہے کہ اگرچہ علم و فضل میں اس پایہ کو پہنچ گئے تھے کہ خود اُن کی تصانیف ملک میں مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ تاہم اساتذہ کے سامنے کتاب لے کر بیٹھنے میں اُن کو عار نہ تھی۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ خود میں نے اُن کو اس حالت کمال میں کمال الدین شافعی سے مجسطی پڑھتے دیکھا تھا۔[4] امام داؤد ظاہری کی مجلس میں چار سو عالم صاحب طیلسان حاضر ہوتے تھے اور شیخ ابو حامد اسفرائنی کے درس میں تین سو تک فقہا شمار کئے گئے۔[5]

امام نحو یونس نے اٹھاسی برس کی عمر پائی۔ ابن خلکان اُن کی نسبت لکھتے ہیں کہ ساری عمر اُنھوں نے شادی نہیں کی اور مرتے دم تک اُن کے پیش نظر سوائے طلب علم اور مذاکرہ علمیہ کے کچھ نہیں رہا۔[6]

بذل اموال افلاس کی حالت میں علمائے کرام کی ہمت کا جو عالم رہا اُس کو ہم مفصل گزارش

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۶ [2] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۱۴۰ [3] کشف الظنون۔ ج ۲ صفحہ ۱۱۴
[4] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ [5] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۱۹ و ۱۷۶ [6] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۱۶

کرچلے ایک دوسرا پہلو دیکھنا ابھی باقی ہے۔ یعنی دولت وتمول کا جس کی نسبت مشہور ہے ؎

چوں بدولت برسی مست نگردی مردی
بادہا خوردن و ہشیار نشستن سہل ست

اثر اُن کے علمی شوق پر کیا پڑا۔ افلاس انسان کے حوصلے کو پست کرتا ہے اور دولتمندی قوائے دماغی کو کند اور سست کرنے والی ہے۔ جس طرح افلاس میں مستقل مزاج رہنا دشوار ہے اُسی طرح نشۂ دولت میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا مشکل ہے۔ اگر واقعات یہ ثابت کردیں کہ علمائے سلف ثروت میں بھی ویسے ہی طالب علم تھے جیسے افلاس میں تو یہ کہا جائے گا کہ اُنھوں نے علم کے دو زبردست دشمنوں کو اپنی مردانہ ہمت سے زیر کرلیا تھا۔ علی ابن عاصم بیان کرتے ہیں کہ ابتدائے طالب علمی میں میرے والد نے ایک لاکھ درہم مجھ کو دیئے اور کہا کہ بیٹا یہ لاکھ درہم لو اور علم کی تحصیل میں صرف کرو۔ مگر یہ یاد رہے کہ ان لاکھ درہموں کا معاوضہ ایک لاکھ حدیثوں سے ہوگا۔ علی ابن عاصم نے باپ کی توقع کو ضائع نہیں کیا۔ اُن کے محدثانہ کمال کا یہ شاہد عدل ہے کہ اُن کو دربار علم سے مسند عراق کا خطاب عطا کیا گیا[1]۔ ہشام ابن عبیداللہ نے (جو شوق طلب میں سترہ سو شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے) سات لاکھ درہم راہ طلب میں صرف کیے۔ اسی طرح ابن متوکل بخاری نے اسّی ہزار درہم۔ حافظ کبیر ابن سنجر نے نو ہزار اشرفیاں۔ حافظ ابن رستم نے تین لاکھ درہم اور امام ذہبی نے ڈیڑھ لاکھ درہم طلب علم میں صرف کیے[2]۔

ابو بکر جوزقی کی نسبت روایت ہے کہ اُنھوں نے طالب علمی میں ایک لاکھ درہم خرچ کیے اور جس فن کو اتنا گراں خریدا اُس کو کبھی سستا نہیں بیچا یعنی اُس کے ذریعے سے کبھی دنیا نہیں کمائی[3]۔ ابو یوسف سدوسی حافظ علامہ جن کی مسند کبیر فن حدیث میں ایک گراں مایہ

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۰۹ [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۵۵ = ج ۲۔ صفحہ ۱۰ و ۱۵۶ و ۱۷۴ و ۱۱۴ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۱۹

کتاب ہے بہت متمول اور با ثروت تھے چالیس کاتب اُن کی سرکار میں شب و روز کتابوں کی نقل کے واسطے حاضر رہتے۔ اگلے علما جس حوصلے اور ہمت سے کتابیں تصنیف کرتے تھے وہ اس سے عیاں ہے کہ جس مُسند کو کبیر کا خطاب ملا ہے اُس کی تیاری اور تکمیل میں دس ہزار اشرفیاں صرف ہوئی تھیں[۱]۔ ابو مسلم صاحب سُنن نے اول مرتبہ روایت حدیث کرنے کی خوشی میں دس ہزار درہم خیرات کئے۔ فاروق خطابی اُن کے ایک شاگرد راوی ہیں کہ جب ہم لوگ اُن سے سُنن سن کر فارغ ہوئے تو ہماری ضیافت اُنھوں نے بڑی دھوم سے کی جس میں ایک ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں[۲]۔ اسی طرح جب ابن احمد ہمدانی نے پہلی بار اپنے وطن ہمدان میں املائے حدیث کیا تو سات سو اشرفیاں طلبائے حدیث کی نذر کیں[۳]۔ شاہ عبدالعزیز صاحب حافظ ابن حجر عسقلانی کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب حافظ ممدوح بخاری کی شرح فتح الباری کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اس مسرت میں اُنھوں نے ایک شاندار دعوت پانسو اشرفی لگا کر کی[۴]۔ دارقطنی کے اُستاد امام دعلج کی سرکار سے محدّثین مکہ مکرمہ و عراق و سجستان کے وظائف مقرر تھے[۵]۔ امام لیث حافظ ابو عبداللہ رازی آخر دفعہ بصرے گئے تو صرف کاتبین کی اُجرت کی بابت دس ہزار درہم ادا کئے[۶]۔

مسلمانانِ سلف میں عموماً علمی ذوق

علمائے سلف کی علمی شیفتگی سے بحث کرنے کے بعد غالباً ایک نظر اُس زمانے کے عام اہل اسلام کی علمی حالت پر ڈالنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس دور شائستگی میں جس طرح ہر شائستہ ملک و ملت کے فی صدی تعلیم یافتہ آدمیوں کی صحیح تعداد آئینہ ہو رہی ہے اُس طرح ہم اگلے زمانے

[۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۵۵ [۲] تذ۔ ج صفحہ ۱۹۵ [۳] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۹۴ [۴] بستان۔ صفحہ ۱۲۸
[۵] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۹ [۶] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۶

کے خواندہ مسلمانوں کا ٹھیک شمار پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر بہت سے واقعے کتابوں میں ایسے ملتے ہیں جن کی مدد سے قیاس اپنا کام کرسکتا ہی اور ایک تخمینی حالت پچھلے مسلمانوں کے بکثرت تعلیم یافتہ ہونے کی ہمارے ذہن میں پیدا ہو سکتی ہی۔ اس مبحث کو ہم تین حصّوں پر تقسیم کرتے ہیں [1] عامۂ مسلمین میں علم کا شوق اور رواج۔ [2] بیبیوں میں علم کا چرچا۔ [3] امرا میں علم۔

عامۂ مسلمین میں علم کا شوق اور رواج

عامۂ اہل اسلام میں علمی رواج و مذاق کا پتا لگانے کے تین ذریعے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اولاً ان حاضرین کی تعداد جو ایک ایک حلقۂ درس میں شامل اور حاضر ہوتے تھے۔ ثانیاً اُن اہل کمال کا شمار جو ایک ایک شہر میں تھے۔ ثالثاً چند متفرق حکایتیں۔

یحییٰ ابن جعفر بیکندی بیان کرتے ہیں کہ علی ابن عاصم کے حلقۂ درس حدیث میں تیس تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا تو اُس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ سلیمان ابن حرب کے واسطے بغداد میں قصر خلافت کے قریب ایک مرتفع جگہ مثل منبر تیار کی گئی تاکہ اُس پر بیٹھ کر املاے حدیث کریں۔ اُس مجلس میں امیرالمومنین مامون الرشید اور تمام امرائے خلافت حاضر تھے جو لفظ امام ممدوح کے منھ سے نکلتا اُس کو امیرالمومنین اپنے قلم سے لکھتے جاتے۔ جب کل حاضرین درس کا تخمینہ کیا گیا تو چالیس ہزار نفوس اندازہ میں آئے۔ امام عاصم ابن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں۔ ایک بلند چبوترے پر بیٹھتے تھے اُن کے مستملی ہارون نے اپنے کھڑے ہونے کے واسطے ایک خمدار کھجور کا درخت پسند کر رکھا تھا۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار ایک اپنا معتمد اُس مجلس کے شرکا کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا۔ معتمد نے ارشاد خلافت کی تعمیل کی تو ایک لاکھ بیس ہزار پر حاضرین کی تعداد پہنچی۔ جس قوم کے افراد ایک ایک

مجلس علمی میں سوا سوا لاکھ جمع ہو جائیں قیاس کیجئے کہ اُس قوم کے سینے میں کتنا شوق علم بھڑک رہا ہوگا اور جو شہر اپنے سوا سوا لاکھ باشندے ایک جلسۂ علمی میں بھیجدے وہ کتنا آباد ہوگا۔[1]

یہ واقعات پڑھنے کے بعد یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان مجالس کے حاضرین کے شمار کرنے کا کیا طریقہ تھا اور حقیقۃً ان روایتوں پر وثوق اس طریقے کی صحت و عدم صحت پر موقوف ہے۔ ذیل کا واقعہ اس سوال کا جواب دیگا۔ احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبۂ غسان نامے مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا۔ سات مستملے کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہنچاتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کس قدر آدمی اُس وسیع میدان میں فراہم تھے میدان مذکور کی پیمائش کی گئی اور دواتیں گنی گئیں کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں ہوئیں جو لوگ لکھتے نہ تھے صرف سماعاً شریک تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں۔ جب شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملے اُن کی مجلس میں حاضر تھے۔ اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار۔ ابو الفضل راوی ہیں کہ جب میں نے فریابی سے حدیث سُنی ہے تو قریباً دس ہزار آدمی اُن کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لے کر بیٹھتے۔ امام ذہبی ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری میں یہ شوق اپنے رسول پاک کے اقوال و احوال کا اہل اسلام میں تھا کہ ایک ایک مجلس میں دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں[2]۔ امام بخاری کے صرف ایک شاگرد فربری سے نوے ہزار آدمیوں نے صحیح بخاری کی اجازت حاصل کی تھی[3]۔ جب فراء نے اپنی تصنیف کتاب المعانی (فن ادب) کا املا کیا تو لوگوں نے حاضرین کا شمار کرنا چاہا مگر بوجہ ہجوم کے نہ کر سکے۔ صرف قاضیوں کو

---

[1] تذ ج ۱ صفحہ ۲۹۰ - ۳۶۰ - ۳۶۴ [2] تذ ج ۲ صفحہ ۱۹۶ - ۲۶۳ - ۲۱۰ [3] مقدمہ صفحہ ۵۸۰

گنا تو اسّی تھے[۱]۔ دوسرا ذریعہ عامۂ مسلمین میں علم کی کثرت دریافت کرنے کا اُن باکمالوں کی تعداد ہی جو ایک ایک شہر میں ایک ہی وقت میں موجود تھے۔ جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ فی صدی کتنے طلبہ اعلیٰ تعلیم تک پہنچتے ہیں اور پھر اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو علم وفن کی خدمت کے لئے وقف کر کے کمال حاصل کرتے ہیں تو بے شک باکمالوں کی تعداد مسلمانوں میں علم کے عام اور شائع ہونے کی شہادت بن سکے گی۔ ذیل کے واقعے صرف ایک ایک فن کے کملا تبلاتے ہیں۔ مگر قیاس کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ جس شہر میں نو سو سے زیادہ سند یافتہ طبیب ہونگے اُس میں کتنے محدّث ہونگے۔ کس قدر ادیب اور کتنے مہندس وغیر ذلک۔ پس اولاً ذہن میں کل فن کے باکمالوں کی تعداد ایک فن کے باکمالوں پر قیاس کر کے قائم کیجئے پھر یہ سوچئے کہ کتنے پڑھنے والوں میں ایک باکمال پیدا ہوتا ہی تو عامۂ مسلمین میں کثرت تعلیم کا ایک اجمالی مفہوم ضرور آپ کے ذہن میں قائم ہو سکے گا۔

مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا ہی اور باوجود شیوخ کی اس کثرت کے میں پل[۲] اُتر کر نہیں گیا یعنی ایک ہی شہر میں آٹھ سو اساتذہ حدیث اُن کو ایسے مل گئے جو شیخ کا لقب حاصل کر چکے تھے[۳]۔ ۳۱۹ھ میں خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کو یہ سن کر سخت افسوس ہوا کہ شہر بغداد میں ایک شخص کی جان کسی طبیب کے جہل مرکب کی نذر ہو گئی۔ آئندہ کی انسداد کے لئے رئیس الاطبا ابن ثابت کے نام یہ حکم صادر کیا گیا کہ تمام اطبائے بغداد کا امتحان لیا جائے جو امتحان میں کامیاب ہوں اُن کو سند عطا ہو اور جو ناکامیاب رہیں اُن کو علاج سے روک دیا جائے۔ بغرض مزید احتیاط سند میں اس امر کی تشریح بھی ہو کہ دارندۂ سند کو فلاں فلاں قسم کے امراض کے معالجے کی اجازت ہی تا کہ وہ انہیں امراض کا

---

[۱] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۲۲۸ [۲] غالباً بغداد کا پل جو دجلے پر تھا [۳] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۶۱

علاج کر سکے جن سے اُس کو پوری واقفیت ہو۔ ابن ثابت نے فرمان خلافت کی تعمیل کی اور کُل اطبائے دارالاسلام کا امتحان لیا۔ کیا یہ حیرت خیز بات نہیں ہو کہ بعد امتحان دارالخلافۃ کے دونوں حصّوں میں جن اطبا کو سند علاج عطا ہوئی اُن کی تعداد کچھ کم نو سو تھی۔ فرید براں وہ اطبا اس شمار سے خارج ہیں جو بوجہ شہرتِ فضل و کمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جن کو سرکار خلافت میں تعلق حاصل تھا۔ خدا کو علم ہو کہ ایسے طبیب کتنے تھے اور اُن کی تعداد نو سو کے عدد کو کہاں تک بڑھا دیتی[۱]۔ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار آدمی شہر سے اُن کی مشایعت کو ایسے نکلے جو یا نحوی تھے یا لغوی عروضی تھے یا محدّث یا اخباری[۲]۔

کیا ہم اُنھیں اسلاف کے خلف ہیں جن میں کمال کی یہ کثرت تھی۔ ہماری پست حالت تو ان واقعات کو بھی رستم و اسفندیار کے افسانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھانے پر آمادہ ہی جیسے تین ہزار اہلِ بصیرت ایک شہر بصرے سے باہر آئے تھے ویسے تین بھی آج تمام دنیائے مسلمین میں یقیناً نہیں نکلینگے جس قوم میں یہ قحط رجال ہو اُس کے اگلے شہروں کی یہ مردم خیزی محال تو بے شک نہیں مگر بعید از حال و خیال تو ضرور ہی۔

تیسرا ذریعہ یہ متفرق واقعے ہیں جن سے ایک نہ ایک پہلو سے ہمارا مدعا عیاں ہوتا ہی۔ ابن الاعرابی کوفی نے ایک روز اپنے درس میں دو آدمیوں سے جو باہم باتیں کر رہے تھے اُن کا وطن دریافت کیا۔ ذرا غور سے سُنیے کہ ایک نے اپنا وطن اسیجاب (متصل سرحد چین) تبلایا۔ دوسرے نے اسپین۔ ابن الاعرابی کو اس خیال سے حیرت ہوئی کہ کس قدر دُور و دراز ملک کے باشندوں کو شوق علم کی کشش اُن کی مجلس میں کھینچ لائی تھی۔ امام ابو العباس

---

[۱] عیون۔ ج ۱ صفحہ ۲۲۲ [۲] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶۱

نے ایامِ طالب علمی میں اپنی والدہ سے اجازت چاہی کہ امام قتیبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہوں مگر اجازت نہ ملی اور اُنھوں نے عزم فسخ کر دیا۔ جب اُن کی والدہ رحلت فرما گئیں تو بلخ پہنچے قتیبہ اُن کے پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ کسی جلیل القدر اُستاد کے فیض سے محروم رہ جانا اُن دنوں دُنیائے اسلام میں ایک ایسی مصیبتِ عظمیٰ سمجھی جاتی تھی کہ لوگ ابو العباس کے پاس اُن کی محرومی کی تعزیت کرنے آتے تھے[1] حافظ کبیر ابو نعیم کی کتاب الحلیہ کا پہلا نسخہ جب نیشاپور پہنچا تو وہاں اس کی قیمت ہوئی کہ چار سو اشرفی کو بکا[2]۔ علامۂ محدث ابن فطیس قرطبی کی کتابیں اُن کی وفات کے بعد بیچی گئیں تو چالیس ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئیں[3]۔

بیبیوں میں علم کا ذوق

جن کتابوں کی مدد سے ہم نے یہ اوراق مرتب کیے ہیں وہ عورتوں کے تعلیمی حالات سے اور بھی خاموش ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے کچھ واقعات متفرق ایسے ملے ہیں جو صاف کہہ رہے ہیں کہ ہماری ترقی کے دَور میں انسانی صنفِ نازک بھی ایک علمی شان و مرتبہ رکھتا تھا اور جو کمالات اگلے مسلمان حاصل کرتے تھے اُن میں اُن کی ماؤں اور بہنوں کی مدد غیر معتد بہ نہیں ہوتی تھی۔ امام حافظ ابن عساکر مؤرخ دمشق نے جن اساتذہ سے فنِ حدیث حاصل کیا تھا اُن میں اسی سے زیادہ عورتیں تھیں[4]۔ حافظ ابن حجر تعوالی التاسیس میں اپنے شیوخ میں متعدد جگہ بیبیوں کا نام لیتے ہیں۔ حفید ابن زہر اشبیلیہ کے طبیب مشہور کی بہن اور بھانجی طب اور معالجات کی عالمہ تھیں اور امراضِ نسائی کے معالجے میں بالخصوص اُن کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ خلیفہ منصور (فرماں روائے اندلس) کے محلات کا علاج اُن کے سپرد تھا۔ اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۳ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۳ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۶۲ [4] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۳۔

عموماً گھر کی بڑی بوڑھیاں عورتوں اور بچوں کے علاج کر لیا کرتی ہیں ایسی ہی ابن زہر کی بہن اور بھانجی بھی ہونگی۔ مؤرخ ابن ابی اصیبعہ جو علاوہ علامۂ وقت ہونے کے اعلیٰ درجہ کے طبیب بھی تھے اپنی تاریخ میں ان کی نسبت یہ الفاظ لکھتے ہیں۔ وَكَانَتْ أُخْتُهُ وَابْنَتُهَا هٰذِهٖ عَالِمَتَيْنِ بِصِنَاعَةِ الطِّبِّ وَالْمُدَاوَاةِ وَلَهُمَا خِبْرَةٌ جَيِّدَةٌ بِمَا يَتَعَلَّقُ بِمُدَاوَاةِ النِّسَاءِ [1] یعنی اُس کی (ابن زہر کی) بہن اور بھانجی فنِ طب و معالجات کی عالمہ تھیں اور مستورات کے علاج میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ امام یزید ابن ہارون کو آخر عمر میں ضعفِ بصارت نے کتاب بینی سے معذور کر دیا تھا۔ اُن کی جاریہ اس مصیبت میں اُن کے کام آتی اور وقت ضرورت کتابیں دیکھ کر اُن کے لئے حدیثیں یاد کر لیتی [2]۔ ابن سماک کوفی نے (جو اپنے عہد میں مشہور عالم تھے) ایک مرتبہ تقریر کرنے کے بعد اپنی جاریہ سے پوچھا کہ میرا طرزِ بیان کیسا ہے سخن شناس جاریہ نے کہا کہ تقریر تو اچھی ہے لیکن اتنا نقص ہے کہ تم ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہو۔ ابن سماک "میں اعادۂ کلام اس لئے کرتا ہوں کہ جو مخاطب اول مرتبہ نہ سمجھے ہوں وہ بھی سمجھ جائیں"۔ جاریہ "جب تک کم فہم سمجھیں گے سمجھنے والے مکدر ہو چکیں گے" [3]۔ امام ابن جوزی کو اُن کے والد تین برس کا چھوڑ کر رحلت کر گئے تھے۔ باپ کے بعد یتیم بچے کی پرورش کی کفیل پھوپھی ہوئیں۔ ابن جوزی کی بہت چھوٹی عمر تھی کہ اُن کی پھوپھی اُن کو علما کے حلقۂ درس میں لے جاتیں تاکہ بچپن ہی سے اُن کے کان علمی باتوں سے آشنا ہو جائیں اس حفظ اوقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابن جوزی دس برس کی عمر میں وعظ فرمانے لگے اور بڑھ کر دنیا کے ایک جلیل القدر امام ہوئے [4] امام ربیعۃ الرائے (استاد امام مالک و خواجہ حسن بصری) کے والد فروخ خلافت بنی امیہ کے عہد میں لشکر میں ملازم تھے جس زمانے میں امام ممدوح اپنی والدہ کے بطن میں تھے اُس وقت

؎۱ عیون۔ ج ۲ صفحہ ۰۰ ؎۲ تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۹۲ ؎۳ ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۰۹ ؎۴ تذ۔ ج ۴ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۷۔

خراسان کو ایک لشکر خلیفۂ دمشق کی جانب سے روانہ کیا گیا اور فروخ کی خدمت اس لشکر کے سپرد ہوئی۔ وہ دَور اسلامی فتوحات کا دَور تھا اور مسلمان فرماں روا بر و بحر کو اسلامی پرچم کے نیچے لانے کا تہیہ کر رہے تھے فروخ کو خراسانی مہم میں ستائیس برس لگ گئے جب وہ لوٹے تو جس بچے کو ماں کے پیٹ میں چھوڑ گئے تھے وہ بڑا ہو کر امام وقت بن چکا تھا۔ قصہ مختصر فروخ لوٹ کر اپنے وطن مدینۂ منورہ کو آئے اور گھوڑے پر سوار نیزہ ہات میں لئے گھر پر پہنچے اور دروازے کو نیزے کی انی سے کھٹکھٹایا۔ ربیعہ نے جو کھٹکا سُنا تو دروازہ کھولا اور باہر آئے۔ اگرچہ باپ نے بیٹے کو نہیں پہچانا مگر گھر اُن کا تھا۔ دروازہ کھلنے پر بے تکلف اندر جانے لگے۔ ربیعہ کو یہ دیکھ کر وحشت ہوئی اور للکار کر کہا کہ یا عدُوَّ اللّٰہِ تو میرے مکان میں کس طرح گھسا پڑتا ہے۔ سپاہی منش فروخ کو جن کی رگوں میں فتح کا جوش تازہ تھا یہ سُن کر طیش آیا اور کہا کہ خدا کے دشمن میری حرم سرا میں تیرا کیا کام۔ غرض بات بڑھی اور خدائی پنچ پڑوسی جمع ہو گئے امام مالک بھی اُستاد کا معاملہ سمجھ کر تشریف لے آئے اور مُصلحانہ لہجے میں فروخ سے کہا کہ بڑے میاں آپ کو ٹھرنا ہی مقصود ہے تو دوسرا مکان موجود ہے۔ امام صاحب کی نرمی نے فروخ کے دل پر اثر کیا اور کہا کہ جناب میرا نام فروخ ہے اور یہ مکان میرا ہے۔ ربیعہ کی والدہ نے نام سُن کر پہچانا اور کہا کہ یہ تو ربیعہ کے باپ ہیں۔ اب تو باپ بیٹے گلے ملے اور مل کر خوب روئے۔ دلوں کی حرارت جب رونے سے کم ہوئی تو دونوں گھر میں آئے اور اندر آ کر پھر جوشِ محبت میں صاحبِ دل باپ نے بی بی سے پوچھا کہ یہ میرا ہی بیٹا ہے اُنھوں نے کہا ہاں۔ فروخ جب اطمینان سے بیٹھ لئے تو اُن کو وہ تیس ہزار اشرفیاں یاد آئیں جو چلتے وقت بی بی کو دے گئے تھے اور اُن کی نسبت استفسار کیا۔ زیرک بی بی نے کہا کہ گھبرائیے نہیں۔ حفاظت سے رکھی ہیں۔ ربیعۃ الرائے اس عرصے میں مسجد نبوی میں جا کر

اپنے حلقۂ درس میں متمکن ہوئے جس میں امام مالکؒ اور خواجہ حسن بصری سے اعیان شامل تھے تلامذہ کا یہ ہجوم تھا کہ چاروں طرف سے شیخ کو گھیرے ہوئے تھے۔ فروخ جو نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو وہاں یہ عالم دیکھا اور دیر تک شوق سے اس مجمع کو دیکھتے رہے۔ ربیعہ اُس وقت سر جھکائے ہوئے تھے اور سر پر اونچی ٹوپی تھی۔ اس لئے باپ کو ایک دفعہ پھر بیٹے کے پہچاننے میں دقت ہوئی اور انھوں نے متعجب ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ یہ شیخ کون ہے سامعین نے جواب دیا ربیعہ ابن عبدالرحمن۔ فروخ کے اُس وقت کی مسرت کا اندازہ سوائے عالم الغیب کے کون کرسکتا ہے۔ فرطِ مسرت میں اُن کی زبان سے بے اختیار نکلا لَقَدْ رَفَعَ اللهُ ابْنِيْ۔ جب خوش خوش گھر آئے تو بی بی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ بی بی نے کہا کہ آپ کو کیا زیادہ پسند ہے بیٹے کی یہ شان یا تیس ہزار اشرفیاں۔ شوہر نے کہا کہ واللہ میں اس شان کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ بی بی۔ میں نے وہ اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم میں صرف کردیں۔ زندہ دل شوہر وَاللهِ مَا ضَيَّعْتِيْهِ (قسم رب کی تم نے وہ مال ضایع نہیں کیا) اس واقعے میں امر قابلِ غور ہے کہ ایک بچہ باپ کی تربیت سے محروم ہو کر ماں کی حفاظت میں رہے اور ماں کے قبضے میں تیس ہزار اشرفیاں ہوں پھر اُس بچے کو ایسی بیش بہا تعلیم دی جائے کہ اُس کے شاگرد دنیا کے نام اور امام ہوں۔ بے شک یہ اُس عہد کی عورتوں کے عقیل اور علم دوست ہونے کی دلیل ہے ہمارے ملک میں اگر چودھویں صدی کی کسی ماں کے اختیار میں تیس ہزار اشرفیاں اور ایک بچہ دے دیا جائے تو معلوم نہیں بلند اقبال صاحبزادے کے اخلاق کہاں تک ترقی کریں[1]۔ عربی کی ریاضیات میں شرح چغمینی جس پائے کی کتاب ہے اُس سے ہر اک مشرقی طالب علم واقف ہے لیکن یہ بات بہت کم معلوم ہو گی کہ اگر قاضی زادہ روم کی خواہر اپنے بھائی کی مددنہ

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۸۲

کرتیں تو ہمارے کتاب خانے اس مشہور کتاب سے محروم رہتے۔ شارح خنبنی نے ابتدائے علوم کی تحصیل اپنے وطن روم میں کی تھی۔ جب اساتذۂ عجم کے کمال کا شہرہ اُنھوں نے سُنا تو خراسان کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ اور چپکے چپکے سامانِ سفر کرنے لگے۔ بہن زیرکی سے بھائی کے ارادے کو پاگئیں اور بجائے اس کے کہ رو پیٹ کر گھر بھر کو خبردار کر دیتیں اپنا بہت سا زیور بھائی کے سامانِ سفر میں چھپا چھپا کر رکھ دیا تاکہ مسافرت میں خرچ کی طرف سے پریشانی نہو۔ بہن کے اس عزیز توشے نے جو نفع دیا ہوگا اس کا اندازہ علامہ بھائی کے دل سے کوئی پوچھتا۔[1]

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ امام بخاری نے جب چودہ برس کے سن میں علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا شروع کیا تھا تو اُن کی والدہ اور خواہر نگرانی کی متکفل تھیں۔

اُمرا میں علم کا ذوق

ہم اس عنوان میں صرف دو تین مثالیں بیان کرینگے۔ مثالوں کی قلت کسی ذہن میں واقعات کی قلت کا شبہ نہ پیدا کرے۔

ابتدائی ہجری صدیوں میں مسلمان اُمرا عالم ہونے کی حیثیت سے علما کے پہلو بہ پہلو رہے ہیں۔ بنی موسیٰ اور سیف الدولہ کے فضل و کمال سے کون واقف نہیں۔ مگر چونکہ ہم دوسرے وادی میں ہیں اس لئے انھیں مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُستاد ابن عمید فرزیر آل بویہ نے ایک دفعہ بیان کیا کہ میں اس خیال باطل میں تھا کہ وزارت و ریاست سے زیادہ پُرلطف کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ مگر جب میں نے سلیمان ابن ایوب طبرانی اور جعانی کا مناظرہ سُنا تو اُس لطف کو بھول گیا۔ اس مناظرہ میں طبرانی قوت حافظہ کے زور سے اور جعانی جودت ذہن کی مدد سے اپنے اپنے حریف پر غالب آنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی آوازوں میں بلندی پیدا ہونے لگی۔ ایک بار جوش میں جعانی نے کہا کہ میرے پاس

---

[1] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۱

ایک ایسی حدیث ہی جو سارے عالم میں کسی کے پاس نہیں - طبرانی "بسم اللہ سنائیے" جعانی نے سلسلۂ روایت شروع کیا - ابو خلیفہ تا سلیمان ابن ایوب - طبرانی - "سلیمان ابن ایوب میرا ہی نام ہی - اور ابو خلیفہ نے یہ حدیث مجھ ہی سے حاصل کی تھی اب تم مجھ سے اس کی سند عالی حاصل کر لو" جعانی یہ سن کر دم بخود رہ گئے - مجھ کو طبرانی کے اُس وقت کی فرحت دیکھ کر یہ تمنا ہوئی کہ کاش میں طبرانی ہوتا تاکہ یہ لطف مجھ کو نصیب ہوتا[1] - ادیب بے مثل صاحب ابن عباد فخر الدولہ کے وزیر تھے ایک موقع پر امیر بخارا نوح سامانی نے اپنی وزارت کے لیے درپردہ اُنھیں طلب کیا - ابن عباد نے خفیہ نہ آسکنے کے جو عذر لکھے اُن میں یہ بھی تھا کہ صرف میری کتابوں کے اٹھانے کے لیے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی ہی - وزیر ممدوح کے ہمراہ ہر سفر میں صرف ادب کی کتابوں کے تیس اونٹ رہتے تھے[2] - علامہ موفق الدین بغدادی ایک بار قاضی فاضل سے (جو سلطان صلاح الدین کے سب سے زیادہ مقرب امیر تھے) ملنے گئے تو اُن کو اس حال میں پایا کہ خود لکھ رہے تھے اور دو کاتبوں کو مضمون تبلاتے جاتے تھے - ان کے پہنچنے پر بہت سے علمی نازک سوال اُن سے کئے مگر لکھنا اور مضمون تبلانا برابر جاری رہا - علامہ ممدوح بیان کرتے ہیں کہ وہ شخص سراپا قلب و دماغ معلوم ہوتا تھا دوران تحریر میں لب اور چہرے سے جو طرح طرح کی حرکات ہویدا ہوتی تھیں وہ صاف کہہ رہی تھیں کہ کس قدر دولتہ اُس کی طبیعت میں مضمون آفرینی کا تھا[3] -

---

[1] تذ - ج ۳ - صفحہ ۱۲۹ [2] ابن - ج ا - صفحہ ۹۶ و ۹۴ ۳۳ [3] عیون - ج ۲ - صفحہ ۲۰۵

عنوانِ دوم

حق پسندی و راست گوئی

جس پاک گروہ کو ہم نے مدارس میں سرگرمِ طلبِ علم چھوڑا تھا اب اُس کی نسبت یہ دیکھنا ہی کہ مکتب اور مدرسہ سے باہر آکر اُس کے اخلاق اور اُس کی طرز معاشرت کیسی رہی اس سے علاوہ اس کے کہ علما کے مزید حالات معلوم ہوں ہماری گزشتہ تعلیم کی نسبت یہ رائے قایم ہو سکے گی کہ وہ کس ڈھنگ کے انسان پیدا کرتی تھی۔ عنوان ہذا میں ہم اخلاق انسانی کی سب سے اعلیٰ اور افضل صفت کو اپنا موضوع قرار دیتے ہیں وہ کیا۔ حق پسندی اور راست گوئی۔

دنیا میں شاید کوئی انسان ہوگا جو اس امر کا مدعی نہو کہ وہ حق اور راستبازی پر دل و جان سے شیدا ہی لیکن عمل (جو قول کی کسوٹی ہی) صاف کھرے اور کھوٹے کی حقیقت کھول دیتا ہی۔ اور حق یہ ہی کہ حق پسندی جتنی بے بہا صفت ہی اُسی قدر دشوار اور معرکہ خیز ہے وہ شخص بے شک حق پرست ہو سکتا ہی جو زبردست کے خوف۔ منفعت کی اُمید اور عزیزوں کی محبت کو حق پر سے نثار کر دے یا بالفاظ دیگر سوائے حق کے اُس کو کسی سے کچھ سروکار نہو۔ کیا فرمایا تھا حضرت خیر البشر نے اپنے صحابی جناب عمرؓ کی نسبت فترکہ الحق و مالہ من صدیق یعنی حق گوئی نے عمرؓ کو بے یار کر کے چھوڑا اگر ایسے انسان دُنیا میں بہت کم ہوئے ہیں۔ خداوند تعالیٰ جن دلوں کو اس قدر بے لوث فرما دیتا ہی کہ وہ بجز حق کے سب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں وہ البتہ اس عالی رتبے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک سچ

کی خاطر زبردست سے بے خوف - فائدے سے بے پروا اور عزیزوں سے نا آشنا رہنا بیحد مشکل ہی اور غالباً کسی آدمی کی حق پرستی کے امتحان کے لئے ان حالتوں سے زیادہ عمدہ معیار ہات آنا ناممکن ہی - لہٰذا ہم علمائے سلف کی حق پسندی انھیں تینوں حق کے دشمنوں کے مقابلے میں ثابت کریں گے ورنہ وعظ اور تصنیف یہ دونوں تو بڑے دل کشا میدان اظہار حق کے ہیں -

حق پسندی بمقابلۂ حکّام

لفظ حکام میں جس قدر جبروت اور قہاری اگلی تاریخ میں نظر آتی ہی اُس کی نظیر آج کل کے آئینی عہد میں بنی ناممکن ہی - جس سلطنت کے زیر سایہ ہم رہتے ہیں وہ تو ایسی امن دوست و رفاہ پسند ہی کہ ان مہیب صفات کا کوئی شمہ ان ممالک میں نہیں پایا جاتا الحمد للہ علی ذلک مگر سارے عالم کے مجبر اخبار بھی ہم کو زمانہ حال میں کوئی ایسا فرماں روا نہیں تبلاتے جس کے دربار میں حجاج ابن یوسف یا تیمور کی ہیبت کا نشان مل سکے - پس جب ہم اس دور عافیت میں حق پسندی کا قحط پاتے ہیں تو اگلے زمانہ میں اس صفت کا وجود عنقا ہونا چاہیئے تھا - لیکن واقعات اس کے خلاف ثابت کرنے کو آمادہ ہیں - ان واقعات کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہی کہ جن بزرگوں نے اگلے جلاد بادشاہوں کے عہد میں حق کو نباہا اُنھوں نے بڑا کام کیا -

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) نے حجاج کو خطبہ پڑھتے دیکھا تو غضب آلود ہو کر برملا فرمانے لگے - خدا کا دشمن اخدا کی حرام کی ہوئی باتوں کو اس نے حلال کر لیا - خدا کے گھر کو خراب کیا اور خدا کے دوستوں کو قتل - حجاج نے اپنی نسبت یہ سخت کلمات سُن کر پوچھا کہ یہ کون ہی - کسی نے کہا عبد اللہ ابن عمر - اتنا سُن کر وہ سفاک آپ کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ بڑے میاں اب تم سٹھیا گئے ہو اور تمہارے حواس بجا نہیں رہے - منبر سے اُترا تو دل میں بخار بھرا ہوا تھا اپنے ایک ملازم کو ایما کیا اور اُس نے ایک زہر میں بجھا ہوا حربہ

حضرت ابن عمر کے پاؤں پر مار دیا اسی ہتھیار کی سمیت آپ کی وفات کا باعث ہوئی - مزید عنایت دیکھئے کہ جو مرض خود پیدا کیا تھا اُس کی عیادت کو آیا - مگر حضرت عبداللہ نے نہ اُس کے سلام کا جواب دیا نہ کلام کا[۱]- جو واقعہ ہم آگے بیان کرتے ہیں وہ استقلال و ثابت قدمی کی ایک بے نظیر مثال پیش کرتا ہی اور اُس سے ظاہر ہوتا ہی کہ حق پرستی اُن بزرگوں کے دل ایسے مضبوط کر دیتی تھی کہ موت اُن کے سامنے کھڑی ہوتی اور وہ بے پروائی سے ہنستے - ور جلاد کے ہات میں شمشیر برہنہ اُن کے واسطے کوئی خوفناک چیز ثابت نہوتی ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ جلیل القدر تابعی حضرت سعید ابن جُبیر سے دولت بنی اُمیہ مخالف ہو گئی تھی اور یہ بچتے پھرتے تھے - مگر ایسی زبردست سلطنت کے پنجے سے بچنا ناممکن تھا - والی مکہ نے ایک موقع پر ان کو پکڑ کر حجاج کے پاس بھیجدیا - اُس کی جفا جو طبیعت کو گویا ایک ضیافت ہات آئی - اول تو نام پوچھا - اُنھوں نے فرمایا کہ سعید ابن جُبیر - حجاج اس قدر طیش میں تھا کہ اُس کو اُن کے نام کے اچھے الفاظ بھی تلخ معلوم ہوئے - اور جوش غضب میں کہا کہ انت شقی بن کسیر سعید - میری والدہ میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں - حجاج اور بگڑا اور کہا کہ شَقِيَتْ اُمُّكَ وَشَقِيتَ أَنْتَ یعنی تمہاری والدہ بھی بدبخت اور تم بھی بدبخت - سعید غیب کا جاننے والا تیرے سوا اور ہی حجاج (جلکر) دیکھو تو میں تم کو دنیا کے بدلے میں کیسی لپٹیں مارتی ہوئی آگ دیتا ہوں - سعید - اگر میں یہ جانتا کہ یہ تیرے اختیار میں ہی تو میں تجکو اپنا معبود بنالیتا - اب حجاج نے (جو اُن کے قتل کے لیے بہانہ ڈھونڈھتا تھا) اُن سے مذہبی سوال شروع کیے جو پیچیدہ پہلو لیے ہوئے تھے - اور پوچھا کہ آں حضرت کی نسبت تمہارا کیا قول ہی - سعید - آپ نبی رحمت اور امام ہدیٰ تھے - خلفا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہی

---

[۱] تذ - ج ۱ - صفحہ ۳۲

سعید- لست علیهم بوکیل (میں ان کا قاضی نہیں) حجاج- اُن میں کون سب سے بہتر تھا۔ سعید ارضاھم لخالقی جو میرے مالک کی مرضی کا سب سے زیادہ پابند تھا۔ حجاج- کون سب سے زیادہ رضا جو تھا- سعید- علم ذٰلک عند الذی یعلم سرّھم ونجواھم (اس کو وہ خوب جانتا ہے جو اُن کے بھیدوں سے اور پوشیدہ باتوں سے واقف ہے) غرض عرصے تک اس قسم کے سوال و جواب ہوتے رہے مگر حضرت ابن جُبیر نے کوئی موقع گرفت کا نہیں پیدا ہونے دیا۔ اور اپنے صاف صاف مگر بچے تُلے جوابوں سے حجاج کی برہمی برابر بڑھاتے گئے۔ آخر اُس نے کھسیا کر کہا اختر یا سعید ای قتلۃ اقتلک (اے سعید بتاؤ میں کس شکل سے تم کو قتل کروں)- سعید- اختر یا حجاج لنفسک فواللہ لا تقتلنی قتلۃ الا قتلک اللہ مثلھا (اے حجاج تو خود ہی پسند کر قسم رب کی جس طرح تو مجھ کو قتل کریگا اُسی طرح خدا تجھ کو قتل کریگا) حجاج کیا میں معاف کر دوں- سعید- اگر عفو ہو تو خدا کی طرف سے ہو- رہا تو میں تو نہ کسی کو بری کر سکتا ہے نہ کسی کا عذر قبول- اتنی بحث کے بعد حجاج نے آخری حکم دیدیا اور جلاد حضرت جبیر کو باہر لائے- حجاج تو اپنی انتہائی طاقت صرف کر چکا تھا لیکن خدا کے سعید بندے کو ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی- باہر آکر ہنسے- حجاج کو خبر ہوئی تو اُس نے پھر بلایا اور ہنسی کی وجہ دریافت کی ابن جُبیر نے فرمایا عجبت من جرأتک علی اللہ وحلم اللہ علیک (مجھ کو خدا کے مقابلے میں تیری جرأت پر اور تیری نسبت خدا کے حلم پر تعجب ہوا) حجاج اس گرم فقرے کو سُن کر اور بھڑکا اور جلادوں سے کہا میرے سامنے گردن مارو- اب ابن جُبیر شہادت کے لیے مستعد ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر فرمایا- وجھت وجھی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین[1]- حجاج- ان کا موُنھ قبلے سے پھیر دو- سعید

---

[1] میں نے اپنا موُنھ کیا اُسی کی طرف جس نے بنائے آسمان و زمین یک طرف کا ہو کر اور میں نہیں شریک کرنے والا۔

اینما تولوا فثم وجہ اللہ (جدہر تم پھروگے اُسی طرف خدا کا مونھ ہی)۔ حجاج۔ اوندھا ڈال دو۔ سعید۔ منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃ اخریٰ (ہم نے اُسی سے (یعنی زمین سے) تم کو پیدا کیا اور اُسی میں تم کو لوٹا ئینگے اور اُسی سے ایک دفعہ تم کو پھر نکالینگے) حجاج نے اُن کی سیف زبانی سے تنگ آکر جلادوں کو اشارہ کیا کہ جلد اپنا کام کرو۔ سعید۔ سُن لے۔ میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہی اور کوئی اُس کا شریک نہیں۔ اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں میری جان تو لے جب تو میدانِ حشر میں مجھ کو ملے گا تو میں تجھ سے لونگا۔ حضرت ابن جبیر کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ جلاد کا ہات اُٹھا اور اُن کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

بنا کردند خوش رسمی بخون وخاک غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بعدِ قتل اُن کے جسم سے خلافِ معمول خون بہت نکلا۔ جس سے حجاج سے سفاک کو بھی حیرت ہوئی اور اُس نے اپنے طبیب خاص تیاذوق سے اس کی وجہ دریافت کی۔ تیاذوق نے کہا کہ چونکہ ان کی خاطر بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف قطعاً اُن کے دل میں نہ تھا اس لئے خون اپنی اصلی مقدار پر قائم رہا۔ بخلاف اور مقتولوں کے کہ اُن کا خون ہیبت کے مارے پہلے ہی خشک ہو جاتا ہی۔ علاوہ اس طبی شہادت کے حضرت ابن جبیر کے کلام کی برجستگی صاف کہہ رہی ہی کہ اُن کی طبیعت بالکل آسودہ اور آرمیدہ تھی اور اضطراب کا نام بھی اُن کے قلب میں نہ تھا۔ یہ شعبان ۹۵ھ کا واقعہ ہی۔ رمضان سنہ مذکور میں حجاج بھی راہئی عدم ہو گیا ؎

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند[1]

انھیں کے ہم نام اور ہم عصر دوسرے تابعی حضرت سعید ابن المسیب کا ذکر ابن السائب کرتے ہیں

---

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۰۵ و عیون۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۳

کہ ایک روز وہ اور میں دونوں بازار میں بیٹھے تھے کہ خلیفۂ دمشق کا برید (نامہ بر) وہاں سے گزرا ابن المسیب نے اُس سے پوچھا کہ تم بنی مروان کے برید ہو۔ برید۔ جی ہاں۔ ابن المسیب۔ تم نے اُن کو کس حال میں چھوڑا۔ برید۔ بخیر۔ ابن المسیب۔ نہیں بلکہ تم نے اُن کو اس حال میں چھوڑا ہی کہ وہ آدمیوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ برید یہ سُن کر بگڑ گیا۔ اور آنکھیں نکال کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ ابن السائب کہتے ہیں کہ میں دہشت زدہ ہو کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھیے اب کیا ہو۔ برید دیر تک تیور بدلے کھڑا رہا مگر پھر کچھ سوچ کر چلدیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کہا ابن المسیب خدا تم کو نیکی دے تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ انھوں نے فرمایا بیہودہ چپ رہ جب تک میں حق پر قائم ہوں واللہ خدا مجھ کو دشمنوں کے قبضے میں نہ دیگا۔ ایک دفعہ تیس ہزار درہم دولت مذکور کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کیے گئے تو اُنھوں نے فرمایا کہ نہ مجھ کو بنی اُمیہ کی پرواہ ہی نہ اُن کے مال و دولت کی۔ میں خدا کے سامنے جاؤنگا اور وہ میرا اور اُن کا انصاف کریگا۔ انھیں حق گوئیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ عبد الملک نے جاڑے کے موسم میں اُن کو ننگا کر کے سرد پانی ڈلوایا اور ایک دوسرے موقع پر پچاس درے لگوا کر سر بازار تشہیر کرائی[1]۔ عمر بن ہبیرہ جب خلیفۂ دمشق یزید ابن عبد الملک کی جانب سے والی عراق و خراسان مقرر ہو کر آیا تو اُس نے خواجہ حسن بصری۔ امام ابن سیرین اور امام شعبی کو طلب کیا اور اُن کے سامنے یہ مدبرانہ تقریر کی یزید ابن عبد الملک کو خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں پر خلیفہ مقرر کیا ہی اور اُن سے اُس کی اطاعت کا عہد لیا ہی اور ہم سے (یعنی ملازموں سے) اُس کے حکم سننے اور بجا لانے کا۔ مجھ کو جو عہدہ خلافت کی طرف سے عطا ہوا ہی وہ آپ سب کو معلوم ہی۔ خلیفہ کی جانب سے ایک حکم مجھ کو ملتا ہی اور میں اُس کی بے تامل تعمیل کرتا ہوں۔

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۰

اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہی۔ خواجہ حسن بصری نے اس پولیٹیکل گفتگو کا جواب جن صاف اور سچے الفاظ میں دیا وہ قابلِ شنید ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملے میں خدا تعالےٰ سے ڈر اور خدا تعالےٰ کے معاملے میں یزید کا خوف مت کر خدا تعالےٰ تجھ سے یزید کے شر کو دفع کر سکتا ہی۔ مگر یزید اس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ وقت بہت دُور نہیں ہی کہ خداوند عالم تیرے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجے گا جو تجھ کو شاندار تخت اور وسیع محل سے علیحدہ کر کے تنگ قبر میں پہنچا دے گا۔ وہاں سوائے تیرے اعمال کے کوئی تجکو نجات نہیں دلوانے کا۔ اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے تو خوب سمجھ لے کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ اور ناصر مقرر کیا ہی۔ پس خدا کے دین کے خلاف اُس کے مقرر کئے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر۔ کیونکہ خالق اکبر کے مقابلے میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں [1]۔ اسی یزید ابن ہبیرہ نے امام اعظم کو ایک دفعہ طلب کر کے عہدہ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ امام صاحب چونکہ یہ بار اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے لہذا انکار کر دیا۔ ابن ہبیرہ اس انکار سے بگڑ گیا اور گیارہ روز تک دس درے روزانہ ان کے لگوائے۔ تاہم اُس کا اصرار اُن کے انکار پر غالب نہ آسکا۔ اِسی عہدہ قضا کی بدولت امام ابوحنیفہ کے مقدر میں اور سختی لکھی تھی۔ جب منصور بغداد کا خلیفہ ہوا تو اُس کی نظر بھی اُس منصب کے لیے امام ممدوح پر ٹھہری چنانچہ اُن کو کوفے سے طلب کیا اور عہدہ مذکور کے قبول کرنے کی فرمائش کی۔ امام صاحب اب بھی اپنی رائے پر سختی سے قائم تھے لہذا انکار کیا۔ منصور نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم کو قاضی مقرر کرونگا۔ اُنھوں نے جواباً بالقسم فرمایا کہ میں اس عہدے کو منظور نہیں کرونگا۔ خلیفہ نے دوبارہ قسم کھائی۔ اُنھوں نے مکرر قسمیہ انکار کیا اور

---

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۸

اپنے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ میں اپنے آپ کو اس منصب کے قابل نہیں سمجھتا۔ حاجب ابن ربیعہ نے (جو دربار میں حاضر تھا) خلیفہ کی خوشامد کی راہ سے کہا کہ امیرالمومنین قسم کھا چکے ہیں پھر بھی تم انکار کیے جاتے ہو۔ امام فقہ نے فرمایا کہ امیرالمومنین کے لیے کفارۂ قسم ادا کر دینا بہ نسبت میرے زیادہ آسان ہے۔ خلیفہ جب اُن کی رائے کو کسی طرح مقید نہ کر سکا تو خود اُن کو قید خانے بھیجدیا اور بحالت محبوسی سنہ ۱۵۰ھ میں امام اعظم نے وفات پائی۔ ان دونوں واقعوں کے ساتھ ایک تیسرا واقعہ اور ملا لیجئے جس سے امتیاز مراتب کا نکتہ حل ہو گا۔ ایک زمانے میں حاکم کوفہ نے یہ حکم دیدیا تھا کہ ابوحنیفہ فتویٰ نہ دیا کریں۔ چنانچہ امام صاحب نے فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا۔ انھیں روزوں کا ذکر ہے کہ ایک دن امام ممدوح گھر میں تشریف رکھتے تھے بی بی اور بچے پاس تھے۔ صاحبزادی نے روزے کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا بیٹا! یہ مسئلہ اپنے بھائی حماد سے پوچھ لو مجھ کو حاکم کی طرف سے فتویٰ دینے کی ممانعت ہے۔ اس لیے میں تمھارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا[1]۔ کیا اس سے بڑھ کر حق پرستی ہو سکتی ہے۔ عہدۂ قضا قبول نہ کرنا اپنے نفس کا حق تھا جس کو اُنھوں نے حاکم اور خلیفہ کے مقابلے میں برسر دربار نہیں چھوڑا۔ اور فتویٰ نہ دینا حاکم کا حق تھا جس کو اُنھوں نے خلوت اور گھر کی چار دیواری کے اندر بھی ملحوظ رکھا۔ امام یزید ابن حبیب تابعی ایک دفعہ علیل تھے۔ ابن سہیل والی مصر اُن کی عیادت کو آیا۔ اثنائے کلام میں اُس نے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس سے نماز جائز ہے یا نہیں۔ امام نے یہ سن کر غصے سے مونھ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔ جب امیر نے چلنے کا قصد کیا تو اُس کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا کہ تو روزانہ خدا کے بندوں کا تو خون بہاتا ہے اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہے[2]۔ خلیفہ دمشق ہشام ابن عبدالملک

---

[1] ابن ۔ ج ا صفحہ ۲۵۲ و ج ۲ صفحہ ۱۶۳ و ۱۶۴ و ۱۶۶ [2] تذ ۔ ج ا صفحہ ۱۱۶

نے اپنا ایک معتمد امام اعمش کوفی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اُن سے حضرت عثمان کی خوبیاں اور حضرت علی کی بُرائیاں لکھوا لائے۔ جب ایلچی نے خلیفہ کا شقہ دیا تو اُنھوں نے اُس کو پڑھ کر ایک بکری کے موٹھ میں دے دیا بکری اُس کو چبا چکی تو معتمد خلافت سے فرمایا کہ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اُس کے پروانے کا یہی جواب ہی۔ قاصد کو حکم تھا کہ جواب تحریری لائے۔ لہٰذا اُس نے منت کی کہ جو کچھ جواب ہو لکھ دیجئے اصرار سے تنگ ہو کر اُنھوں نے یہ جواب لکھ دیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اما بعد فیا امیر المومنین لو کان لعثمان رضی اللہ عنہ مناقب اہل الارض ما نفعتک ولو کانت لعلی رضی اللہ عنہ مساوی اہل الارض ما ضرتک فعلیک بخویصۃ نفسک والسلام یعنی اے امیر المومنین اگر حضرت عثمان میں سارے جہان کی خوبیاں تھیں تو تجھ کو کچھ نفع نہیں اور اگر حضرت علی میں دنیا بھر کی بُرائیاں تھیں تو تیرا کچھ نقصان نہیں۔ پس تو خاص کر اپنے نفس کی خبر لے۔ والسلام۔

ابو جعفر منصور خلیفہ بغداد نے ایک بار امام عبد اللہ ابن طاؤس کو اپنے پاس بلایا اور اثنائے ملاقات میں ابن طاؤس سے کہا کہ اپنے والد سے کوئی حدیث روایت کرو اس فرمایش سے ابن طاؤس کے ہات اس امر کا گویا موقع لگا کہ وہ خلیفہ کو اُس کی بے اعتدالیوں اور سختی پر تنبیہ کرے۔ اور اُنھوں نے یہ حدیث انتخاب کر کے سُنائی حدثنا ان اشد الناس عذابًا یوم القیامۃ رجل اشرکہ اللہ تعالیٰ فی سلطانہ فادخل علیہ الجور یعنی میرے والد نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہی کہ قیامت کے دن سب سے بڑھ کر عذاب اُس کو ہوگا جس کو خدا تعالیٰ نے اپنی حکومت میں شرکت دے اور پھر وہ ظالمانہ حکومت کرے۔ منصور سے قہار فرماں روا کے سامنے اور یہ جرأت! امام مالک فرماتے ہیں کہ مجھ کو ابن طاؤس کے قتل کا

سلہ ابن ج ۱۔ صفحہ ۲۱۳

پورا یقین ہوگیا اور میں نے اپنے دامن سمیٹ لئے کہ مبادا اُن کے خون کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑیں۔ خلیفہ دیر تک ساکت رہا پھر نگاہ اُٹھائی اور ایک اور سوال کیا۔ ابن طاؤس کے قلب پر اب بھی خلیفہ کا رعب غالب نہیں آیا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی پوری آزادی سے دیا۔ خلیفہ نے تنگ آکر کہا قوما عنی یعنی میرے پاس سے دونوں اُٹھ جاؤ۔ ابن طاؤس نے فرمایا ذٰلِکَ مَاکُنَّا نَبغِی یہ تو ہماری عین مراد ہی۔ اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اُس روز سے میں ابن طاؤس کے فضل کو مان گیا ہوں[1]۔ فقہ کے چار امام جن کی امامت آج تک چار دانگ عالم میں مُسلم ہی اور کروروں نفوس انسانی پر اُن کی روحانی سلطنت صدہا برس سے قایم ہی اُن میں سے امام ابوحنیفہ کا حال آپ سن چکے امام مالک کے ایک دفعہ ستر درّے اس وجہ سے مارے گئے کہ کسی مسالے میں حق کا اور حکومت کا مقابلہ تھا اور انھوں نے فتویٰ دینے میں حق کی رعایت کی تھی[2]۔

یہی سلوک امام احمد ابن حنبل کے ساتھ خلیفہ مامون الرشید کی خلافت میں عقائد کے ایک مسائلے کے اختلاف کی وجہ سے کیا گیا[3]۔ ایک دن کا ذکر ہی کہ خلیفہ منصور کے چہرے پر مکھی بیٹھی اُس نے اڑا دی۔ مکھی حسب عادت پھر آن بیٹھی خلیفہ نے پھر اُڑا دی۔ غرض کئی دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ آخر خلیفہ نے جھلّا کر ابن سلیمان مشہور مفسّر سے پوچھا کہ مکھی پیدا کرنے کی خدا کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ اُس عالم ربّانی نے فرمایا کہ متکبّروں کا غرور توڑنے کے لیئے پیدا کی[4]۔ خلافتِ عباسیہ نئی نئی قائم ہوئی تھی اور خاندان بنی اُمیہ کے نیست و نابود کرنے اور ملک سے اُن کا اثر مٹانے کی کوششیں بڑی بے دردی اور سفاکی سے عمل میں آرہی تھیں کہ اِسی اثنا میں عبداللہ ابن علی خلیفہ سفاح کا چچا شام کا حاکم مقرر ہوا۔ انیبر نذکور نے

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۳ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۳۹ [3] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶ [4] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۲

وہاں پہنچکر اوّل تو خلافت کے بقیہ دعوے داروں کی پوری صفائی کی اُس کے بعد ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا جس میں جاہ وجلال کا اظہار انتہا کو پہنچایا گیا تھا چار جنگی صفیں ایوانِ دربار میں قایم تھیں جو مختلف مہیب ہتھیاروں سے مسلح تھیں۔ ان صفوں کے بیچ میں تختِ امارت نصب تھا جب امیر نے دربار میں آکر جلوس کیا تو شام کے مقتدا امام اوزاعی طلب ہوئے۔ امام ممدوح جس وقت دارالامارۃ کے دروازے پر پہنچے تو گھوڑے پر سے اُتار لیئے گئے اور دو آدمیوں نے اُن کے بازو پکڑ کر تخت سے اتنا قریب لا کھڑا کیا کہ امیر خود اُن سے کلام کر سکے۔ امیر نے اُن کو دیکھ کر کہا کہ تمہارا نام عبدالرحمٰن ہی۔ امام اوزاعی جی ہاں۔ خدا امیر کو صلاحیت دے۔ امیر۔ بنی اُمیہ کی خونریزی کی نسبت تمہاری کیا رائے ہی۔ امام۔ تمہارے اور اُن کے مابین چونکہ عہد تھا اس لیے تم کو لازم تھا کہ عہد وپیماں کی رعایت کرتے اور عہد شکنی نہ کرتے۔ امیر (بگڑ کر) یہ ہم جانیں اور وہ جانیں۔ ہم میں باہم کوئی عہد نہ تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کے تیور پھرے دیکھ کر میرے قلب پر بیکسی کی سی حالت طاری ہوئی اور جان کا خوف معلوم ہونے لگا۔ اُسی وقت مجھ کو خیال آیا کہ عبدالرحمٰن! ایک دن اس سے بھی بڑے حاکم کے حضور میں حاضر ہونا ہی اس خیال کے آتے ہی میرے دل کا اضطراب جاتا رہا اور قوت سی پیدا ہو گئی اور میں نے صاف صاف امیر سے کہا کہ بے شک اُن کا خون تم پر حرام تھا۔ اس زوردار فقرے کو سُن کر امیر طیش کے مارے تھرا گیا جوشِ خون سے آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور رگیں اُبھر آئیں۔ اسی غضب کی حالت میں کہنے لگا کہ ویحک اللہ[1] یہ تم نے کس طرح کہا۔ امام۔ اس طرح کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی کہ کسی فردِ مسلمان کا قتل روا نہیں جب تک کہ اُن تین حالتوں

---

[1] خدا تم پر رحم کرے۔

ع

میں سے ایک حالت پیش نہ آئے یا تو وہ اس حال میں زنا کرے کہ اُس کی شادی ہو چکی ہو۔ یا قاتل ہو۔ یا مرتد ہو جائے۔ امیر۔ کیوں! کیا ہماری حکومت دینی نہیں۔ (گویا اُس کا یہ مطلب تھا کہ چونکہ ہماری خلافت از روئے دین ثابت ہے لہذا اُس کا مخالف تارک دین ہوا) امام تمہاری حکومت دینی کیونکر ہو سکتی ہے۔ امیر۔ کیا آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ کے لیے وصیت نہیں فرمائی۔ امام۔ اگر حضرت علیؓ کے لیے وصیت ثابت ہوتی تو دونوں حَکَم حکم نہ دیتے۔ امیر کے پاس چونکہ اس کا جواب کچھ نہ تھا اس لیے خاموش تو ہو گیا مگر شدت اشتعال کے سبب سے سراپا غضب معلوم ہوتا تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کی خاموشی نے مجھ کو یقین دلا دیا کہ کوئی دم میں میرا سر قدموں پر آتا ہے تھوڑے عرصے کے بعد خلاف توقع امیر نے ہات کے اشارے سے حکم دیا کہ امام دربار سے باہر کر دیئے جائیں چنانچہ یہ وہاں سے تشریف لے آئے۔ دار الامارۃ سے کچھ دُور نکلے تھے کہ ایک سوار ان کی طرف تیز آتا ہوا نظر پڑا۔ سوار کو دیکھ کر جان کا خوف امام اوزاعی کو اوّل سے بھی زیادہ ہوا۔ اور وقت اخیر سمجھ کر نماز شروع کر دی۔ جب سلام پھیرا تو سوار نے سلام کیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی من جانب امیر پیش کی۔ اُنھوں نے وہ اشرفیاں قبول کر لیں اور گھر پہنچنے سے پہلے مستحقوں کو تقسیم کر دیں[1]۔ اسلام نے بیت المال کی بنیاد جن اصول پر ڈالی تھی وہ خلافت راشدہ کے بعد بالکل بدل گئے تھے۔ اور مسلمانوں کا قومی مال محض خلفاء و سلاطین کا جیب خرچ خیال کیا جاتا تھا۔ جو علمائے اسلام بیت المال کے اصلی اغراض سے واقف تھے اُن کے دل اس اسراف کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے۔ اور جب اُن کو موقع ہات آتا اُن کی زبان خلفا کو برملا متنبہ کرنے سے باز نہیں رہتی تھی۔ حضرت سُفیان ثوری ایک دفعہ

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۲

خلیفہ مہدی کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ مجھ کو یہ روایت پہنچی ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سفرِ حج میں صرف بارہ اشرفیاں صرف کی تھیں۔ تمہارا اسراف جس حد کو پہونچا ہے وہ ظاہر ہے۔ خلیفہ نے خشمناک ہو کر کہا تم اپنی سی ذلیل حالت میری بھی کیا چاہتے ہو۔ حضرت سفیان نے جواب دیا کہ مجھ سے مت بنو مگر جس حال میں ہو اُس میں تو کمی کر دو[۱]۔

ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں گئے۔ خلیفہ نے امام صاحب سے حدیث سنانے کی فرمائش کی امام ممدوح نے فرمایا کہ میں نے عرصے سے طریقۂ قرارت چھوڑ دیا ہے اب اور لوگ حدیث مجھ کو سناتے ہیں اور میں سُنتا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ بہتر ہے میں ہی سُناؤنگا۔ مگر اول عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے باہر کر دیجئے۔ امام مالک نے جواب میں ارشاد کیا کہ اگر خواص کی خاطر سے عوام محروم کئے جائیں گے تو خواص کو بھی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر اپنے ایک شاگرد ابن عیسیٰ کو حکم دیا کہ سبق شروع کریں۔ چنانچہ ابن عیسیٰ نے فوراً سبق شروع کر دیا اور خلیفہ کو خاموش رہنا پڑا[۲]۔

خلیفۂ مذکور نے ایک بار ابن ادریس کو بلا کر عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ اُنھوں نے انکار کیا تو رشید نے بگڑ کر فرمایا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ ابن ادریس نے متانت سے جواب دیا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ اور یہ کہہ کر دربار سے چلے آئے[۳]۔ امیر سلیمان ابن علی نے اہواز سے ایک قاصد امام ادب خلیل بصری کے پاس بھیجا اور اُن کو امیر زادے کی تعلیم کے لئے طلب کیا۔ ایلچی کی خبر پا کر وہ ادیب بے مثل باہر آیا خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہات میں تھا۔ وہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا کہ لو میرے پاس تو یہی ماحضر ہے اور جب تک یہ موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پروا نہیں۔ اِس کے بعد یہ اشعار لطیف فی البدیہہ

---

[۱] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۸۵ [۲] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۹۱ [۳] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۲۵۰۔

تصنیف کرکے اُس کے حوالے کیئے ؂

ابلغ سلیمان انی عنہ فی سعۃ | وفی غنی غیر انی لست ذا مال
سخی بنفسی انی لا اری احدا | یموت ھزلا ولا یبقی علی حال
والفقر فی النفس لا فی المال نعرفہ | ومثل ذلک الغنی فی النفس لا المال
فالرزق عن قدر لا العجز ینقصہ | ولا یزیدک فیہ حول محتال[۱]

شہر دمشق ایک صدی تک دولتِ بنی اُمیّہ کا دارالخلافہ رہا تھا اس لئے خارجیت کا وہاں بڑا زور تھا۔ امام نسائی (جن کی سنن صحاح ستہ میں شامل ہے) جب وہاں تشریف لے گئے تو ایک روز مسجد میں ایک شامی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت معاویہ کے فضائل کیا کیا ہیں۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ تو اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی جان بچالے جائیں جو تو اُن کے مناقب پوچھنے چلا ہے۔ اس فقرے کو سُن کر دمشقی بھڑک اُٹھے اور اس قدر ضربیں امام نسائی کے ایک نازک مقام پر ماریں کہ وہ بیہوش ہو گئے۔ حالتِ بیہوشی میں اُن کے رفقا اُن کو مسجد سے باہر لائے اور اُسی دردناک صدمے سے اُس امام حدیث نے وفات پائی[۲]۔ امام سلفی کے درس میں ایک دن پادشاہ مصر مع اپنے بھائی کے آکر شریک ہوا۔ اور وہاں بیٹھ کر بھائی سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سوءادب دیکھ کر امام موصوف نے بادشاہ کو سرزنش کی اور فرمایا کہ ہم حدیث نبوی اس لئے نہیں پڑھ رہے ہیں کہ تم یہاں بیٹھ کر باتیں کرو[۳]۔ ابو غالب نحوی نے جب اپنی کتاب فن لغت میں تصنیف کی تو امیر مجاہد مرشیہ کے باقتدار فرماں روا نے اپنے ایک معتمد کے ہات ایک ہزار اشرفیاں اُن کے پاس بھیجیں اور یہ فرمائش کی کہ کتاب مذکور کے دیباچے میں یہ الفاظ درج کر دیں مما الفہ ابو غالب لابی الجیش

---

[۱] نزہۃ صفحہ ۵ [۲] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۶۹ [۳] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۹۶

مجاھد یعنی اس کتاب کو ابو غالب نے امیر مجاہد کے لیے تصنیف کیا ہی۔ ابو غالب نے عطیہ شاہی واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ساری دنیا مجھ کو دی جائے تو بھی میں جھوٹ بولنا روا نہیں سمجھونگا۔ میں نے یہ کتاب خاص کر امیر کے واسطے تالیف نہیں کی بلکہ عام نفع کے خیال سے لکھی ہی[۱]۔ ابن السکیت مصنف اصلاح المنطق خلیفہ بغداد متوکل کی خدمت میں حاضر تھے کہ خلافہ کے تختِ جگر معتز اور مویّد نمودار ہوئے متوکل نے اُن سے پوچھا کہ یعقوب تم کو کون زیادہ محبوب ہی۔ میرے یہ دونوں بیٹے یا حسینؓ۔ ابن السکیت نے جواب دیا کہ واللہ حضرت علی کا خادم قنبر تم سے اور تمہارے دونوں بیٹوں سے کہیں بہتر ہی۔ کیا اس تصریح کی ضرورت ہی کہ خلیفہ کے دل میں ان الفاظ نے کیا تاثیر کی۔ جس زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے وہ خلیفہ کے حکم سے باہر نکال لی گئی اور زبان کے ساتھ روح نے بھی جسم سے مفارقت کی[۲]۔ قاضی ابن رشد مشہور فلسفی جب امیر منصور خلیفہ اندلس کے حضور میں کوئی علمی مسالہ بیان کرتے تھے تو نشاکمال اُن کے دل سے خلیفہ کی عظمت مٹا دیتا اور اُن معمولی الفاظ سے خطاب کرتے اسمع یا اخی یعنی سُن اے بھائی[۳]۔ مولانا شمس الدین رومی کی عدالت میں ایک معاملے میں سلطان بایزید نے شہادت دی تو شہادتِ سلطانی کو اُنھوں نے قبول نہیں کیا جب سلطان نے وجہ پوچھی تو مولانا نے جواب دیا کہ سلطان نماز میں جماعت کا پابند نہیں اور تارک جماعت کی شہادت مردود ہی[۴]۔ سلطان محمدؐ خاں نے ایک بار اپنا موسوم (مراسلہ) قاضی بروسہ مولانا شمس الدین کورانی کے پاس بھیجا۔ اُس میں کوئی بات خلاف شرع درج تھی۔ مولانا اس کو دیکھ کر اتنا برافروختہ ہوئے کہ سلطانی فرمان پھاڑ کر۔ لانے والے کو باہر نکال دیا سُلطان کو اُن کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اور غضب سلطانی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مولانا کو عہدہ قضا

۱؎ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۹۔ ۲؎ ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۰۹ و ۳۱۱ ۳؎ عیون۔ ج ۲ صفحہ ۷۷۔ ۴؎ شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۔

کے ساتھ سلطنت روم بھی چھوڑنی پڑی[1]۔ مولانا ابن خطیب ایک روز عید کی مبارک باد دینے ایوان سلطانی کو گئے۔ اُن دنوں وہ خزانۂ سلطنت کے وظیفہ خوار بھی تھے۔ اور سو درہم یومیہ اُن کو ملتے تھے۔ جب دربار کو چلے تو چند طلبہ ہم رکاب تھے۔ حضور سلطانی میں پہنچے تو سلطان نے از راہِ حسنِ اخلاق سات قدم بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا نے بجائے جھک کر آداب بجا لانے کے سلام کیا اور بجائے دست بوسی کے مصافحہ۔ اُن کے ایک شاگرد کو اُستاد کا یہ خلاف آداب برتاؤ ناگوار گزرا اور واپسی میں اُس نے کہا کہ آخر سلطان فرمانروائے وقت ہیں کچھ تو آپ کو جھکنا تھا۔ ابن خطیب نے فرمایا کہ آیا یہ فخر سلطان کے لیے کم ہی کہ ابن خطیب سا فاضل اُن کے پاس گیا۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ سلطان اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں[2]۔ مولانا یوسف قاضی قسطنطنیہ ایک دن مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے تو دروازے پر صدر اعظم کے چوب دار کو حاضر پایا جو اُن کے بلانے کو آیا تھا۔ اُس وقت مولانا کے سر پر چھوٹا سا عمامہ تھا۔ چھوٹا عمامہ باندھ کر بارگاہِ وزارت میں جانا خلافِ ادب تھا۔ مگر خدا پرست مولانا کے دل نے گوارا نہ کیا کہ رب العزت سے زیادہ ادب اُس کے ایک بندے کا کریں اُسی عمامے کو باندھے صدر اعظم کے حضور میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو اعتراض ہوا۔ اُنھوں نے راستبازی سے اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا جس کو سُن کر وزیر اعظم نے بہت پسند کیا اور حضور سلطانی میں اُس کی نقل کی[3]۔

معاصرین اور ہمچشموں کے مقابلے میں

عربی کا ایک مقولہ ہی المعاصرۃ سبب المنافرۃ یعنی ہمعصری باہم نفرت کا باعث ہوتی ہی۔ یہ عادت قریباً طبیعت ہو چکی ہی کہ جو ہم فن اہل کمال ایک ہی زمانے میں ہوتے ہیں وہ

---

[1] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۰ [2] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۲ [3] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۲۳

ایک دوسرے کے کمال کا اعتراف کما حقہ نہیں کرتے! الا ماشاء اللہ۔ جب ایک ہی عہد کے دو ہم فن اہل کمال کے دل ٹٹولے جائیں تو اُن کی باہمی بے پروائی رقابت کے اثر سے کم وبیش پرخاش و مغایرت کی حد تک ترقی کئے ہوئے نظر آئے گی۔ شیخ سعدی کے زمانے میں ایک اور فارسی کا شاعر امامی ہروی تھا۔ اُس زمانے کے لوگ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ باکمال ہے چنانچہ ہمگر شیرازی ایک تیسرا شاعر اس بارے میں حکم قرار دیا گیا اور اُس نے امامی کو سعدی سے افضل بتایا۔ یہ ایسا غلط فیصلہ تھا جس کے غلط ہونے میں گزشتہ چھ سو برس کے عرصے میں شاید کسی کو کلام ہوا ہو۔ مگر معاصرت کے اثر نے ہمگر کو اس غلطی کا ادراک نہیں ہونے دیا۔ ہم جن علما کے حالات آپ کو سنا رہی ہیں اُن کے جوشِ حق پرستی نے کبھی معاصرین کے فضل وکمال سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔ واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ وہ بزرگ جوہر اور کمال کے پرکھنے والے تھے اور جن میں یہ جوہر ہوتا تھا اُن کا معاصر۔ عمر میں چھوٹا طبقے میں نیچا مذہباً مخالف ہونا اُن کی قدر شناسی کو کم نہیں کرسکتا تھا۔ امام اعظم امام مالک سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقے میں عالی۔ لیکن جب اُن سے ملے تو اُس ادب سے ملے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ شاعر مشہور ابو اسحٰق عقیدے کا صابی[1] تھا مگر جب وہ مرا تو محض قدر دانی کمال کے لئے ہاشمی نسب شریف رضی نے اس کا مرثیہ لکھا اور لوگوں کے طعن کی کچھ پروا نہیں کی۔ معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ علی الاعلان اُن کو اپنے آپ سے زیادہ عالم وکامل بتائیں۔ اُن کی جلالت کے سامنے اپنی بے مائگی کا اقرار کریں اور جب کوئی مشکل پیش آ جائے تو اُن سے اُس کے حل کر دینے کا سوال۔ یا اُن کہ

---

[1] ستارہ پرست

وہ ان کی تصانیف پر اعتراض کریں تو شکریہ ادا کیا جائے اور دعائے خیر سے یاد۔ ایک موقع پر امام شعبی آں حضرت کے عہد مبارک کے جنگی معرکوں کا بیان کر رہے تھے۔ اتفاقاً حضرت ابن عمر کا گزر اُسی راستے سے ہوا۔ امام ممدوح کا بیان سُن کر فرمایا کہ جس قوم کا یہ ذکر کر رہے ہیں میں اُس کے دیکھنے والوں میں ہوں لیکن مغازی یہ مجھ سے زیادہ اور بہتر جانتے ہیں[1]۔ حضرت امام باقر نے ایک مرتبہ فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی شخص حج کے مسائل عطا سے بہتر نہیں جانتا۔ حضرت امام زین العابدین اپنے ایک شاگرد زید ابن اسلم کے پاس جاکر بیٹھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اس پر تعجب ظاہر کیا تو پاک نفس امام نے فرمایا کہ جس کی صحبت میں دین کا نفع ہوتا ہی اُس کے پاس انسان بیٹھتا ہی[2]۔ ایک دفعہ کا ذکر سُنیئے کہ مدینہ طیبہ میں امام زہری امام ربیعہ کا ہات پکڑ کر ایک مکان میں لے گئے اور وہاں دونوں نے ایک دوسرے کے علم کو جانچا۔ جب عصر کے وقت وہ دونوں امام زمانہ باہر تشریف لائے تو زہری تو یہ کہتے نکلے کہ ربیعہ کا مثل مرتبہ میں نہیں اور ربیعہ یہ فرماتے آئے کہ زہری کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچتا[3]۔ ابن اسحٰق اصفہانی جب بصرے گئے اور وہاں کے محدثین سے حدیث پڑھنی چاہی تو سب نے پوچھا کہ تمہارے شہر میں عباس ابن یزید نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہیں تو فرمایا اُن کے ہوتے ہوئے تم ہمارے پاس کیوں آئے[4]۔ اس واقعے سے واضح ہوتا ہی کہ اُس عہد مبارک میں افراد نہیں بلکہ گروہ کے گروہ حق کے گرویدہ تھے اور حسنِ تعلیم نے سب کے مذاق یکساں پاک و صاف کر دیے تھے۔ امام عمرو ابن دینار امام زہری کے کمالات کا شہرہ سُنکر فرمایا کرتے تھے کہ زُہری کے پاس دہرا گیا ہی۔ میں نے ابن عمر کو دیکھا ہی اُنھوں نے نہیں دیکھا میں نے ابن عباس کو دیکھا ہے اُنھوں نے نہیں دیکھا۔ اندازِ کلام

---

۱ تذ ج ۱ صفحہ ۷۱ ۲ تذ ج ۱ صفحہ ۷۶ ۳ تذ ج ۱ صفحہ ۱۱۹ ۴ تذ ج ۱ صفحہ ۱۰۴ ۵ تذ ج صفحہ ۸۰

صاف کہہ رہا ہی کہ ابن دینار کو کمال کا غرّہ زہری سے بیزار کر رہا تھا۔ حسن اتفاق کہ اسی عرصے میں امام زہری کا مکہ مکرمہ میں گزر ہوا۔ جب ابن دینار نے یہ خبر سنی تو باوجود پاؤں سے معذور ہونے کے فوراً ملاقات کو تیار ہوئے اور خدام سے فرمایا کہ مجھ کو امام زہری کے یہاں لے چلو۔ ملازموں نے تعمیل ارشاد کی اور امام ممدوح کی خدمت میں لے آئے جب ملے تو زیادہ گرویدہ ہوئے اور شب کو وہیں رہے۔ صبح کو واپس آئے تو شاگردوں نے سوال کیا کہ کہیے امام زہری کو کیسا پایا۔ اگلی رائے کو انصاف مغلوب کر چکا تھا۔ فرمایا کہ وَاللّٰہِ مَارَأیتُ مِثلَ ھٰذا القرشی اَبَداً یعنی میں نے اس قرشی کا مثل کبھی نہیں دیکھا[۱]۔ مولانا ابن مؤید رومی جب محقق دوانی کے پاس گئے تو محقق نے اُن سے سوال کیا کہ روم سے ہمارے لیے کیا ہدیہ لائے۔ مولانا نے علامہ خواجہ زادے کی تازہ تصنیف کتاب تہافہ پیش کی۔ محقق نے اوقاتِ فرصت میں مطالعہ کیا۔ جب تمام و کمال دیکھ چکے تو مولانا نے ابن مؤید سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ تم کو اور اس رسالے کے مصنف کو جزائے خیر دے۔ میں بھی اس مبحث پر ایک کتاب لکھنے کے خیال میں تھا۔ مگر اللہ نے شرم رکھ لی۔ اگر میں اس کتاب کے دیکھنے سے پہلے لکھ چکا ہوتا تو میری بڑی ہنسی ہوتی[۲]۔ جب تک حضرت سالم ابن عبداللہ زندہ رہے امام نافع نے فتویٰ نہیں دیا[۳]۔ حضرت سعید ابن المسیب کے پاس جب کوئی حاجت مند فتویٰ پوچھنے جاتا تو امام ممدوح فرماتے کہ سلیمان ابن یسار کے پاس جاکر پوچھو اِس لیے کہ آج وہ سب سے زیادہ عالم ہیں[۴]۔ حضرت قاسم (ابن محمدؐ ابن ابی بکرؓ) سے کسی نے پوچھا کہ آپ زیادہ عالم ہیں کہ سالم (ابن عبداللہ ابن عمرؓ) تو اُنھوں نے فرمایا کہ یہ مرتبہ سالم ہی کو حاصل ہے[۵]۔ فراء نحوی اپنے ہم عصر اخفش اوسط سے ملنے گئے تو

۱؎ ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۵۴ ۲؎ شق۔ ج ۱ صفحہ ۱۵۰ ۳؎ تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۰۰ ۴؎ ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۱۳ ۵؎ ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۴۸

اخفش نے حاضرین سے کہا کہ تمہارے پاس لغت اور عربیت کا سردار آیا۔ فرّا نے کہا کہ جب تک اخفش زندہ ہیں اُس وقت تک نہیں[1]۔ حضرت عبدؓ اللہ ابن مسعود کو جب ضرورت پیش آتی تو وہ زر ابن جیش سے عربیت کے متعلق باتیں دریافت فرمالیا کرتے[2]۔ قابوس نے جب اپنے والد سے یہ سوال کیا کہ آپ صحابہؓ کرام کی موجودگی میں علقمہ (تابعی) کے پاس کیوں جایا کرتے تھے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اس لیے جایا کرتا تھا کہ میں نے بعض صحابہ کو دیکھا تھا کہ وہ علقمہ کے پاس تشریف لے جاکر مسائل دریافت فرماتے تھے[3]۔ خواجہ حسن بصری کو جب کوئی مشکل پیش آجاتی تو بذریعہ تحریر حضرت سعید ابن المسیب سے دریافت فرمالیتے[4]۔ امام ابو احمد کو فن حدیث میں ایک بار اشکال پیش آیا تو اُنھوں نے اپنے معاصر ابن مندہ سے نیشا پور خط بھیج کر حل کرلیا[5]۔ حضرت ابن عمر اکثر امام مجاہد (تابعی) کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا کرتے تھے[6]۔ اشہب ابن عبد العزیز کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؓ کو امام مالکؒ کے حضور میں ایسا مؤدب بیٹھا دیکھا جیسے چھوٹے بڑوں کے سامنے بیٹھتے ہیں[7]۔ امام اعظم امام مالک سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقہ میں بھی اُن سے عالی ہیں۔ اسی واسطے امام ذہبی واقعۂ بالا کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ "اِس سے امام ابو حنیفہؓ کے حسن ادب اور تواضع کی کیفیت معلوم ہوتی ہے"۔ اور حق یہ ہے کہ ان بزرگوں کی عظمت کے اصلی اسباب یہی صفات تھیں۔ حسن ابن علی کہتے ہیں کہ جب دحیم بغداد میں آئے تو میں نے اپنے والد۔ امام احمد ابن حنبل۔ یحییٰ ابن معین اور ابن سالم کو اُن کے سامنے ایسا بیٹھا دیکھا جیسے بچے بیٹھے ہوں[8]۔ امام احمد ابن حنبل کے پاس ایک بار امام ذہلی آئے تو امام ابن حنبل اُن کی تعظیم کے لیے

---

[1] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۰۰ [2] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۴۹ [3] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۴۲ [4] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۷۴

[5] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۳۷ [6] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۸۰ [7] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۰۹ [8] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۶۴

کھڑے ہوگئے دونوں اماموں کے رُتبے میں اس قدر فرق تھا کہ لوگوں کو اس تعظیم سے حیرت ہوئی امام ممدوح نے صرف تعظیم ہی کفایت نہیں کی بلکہ اپنے صاحبزادوں اور تلامذہ کو حکم دیا کہ اُن سے جاکر حدیث حاصل کریں۔[1] سفیان ابن عیینہ سے کسی نے کہا کہ شہر میں حسین ابن جعفی آئے ہیں۔ ابن عیینہ یہ سُن کر بے اختیار کھڑے ہوگئے اور فوراً ابن جعفی سے جاکر ملے اُن کے ہات چومے اور فرمایا کہ آج یہاں ایسا شخص وارد ہوا ہی جس کی فضیلت سب سے بڑھی ہوئی ہی[2] سننے کے قابل یہ بات ہی کہ ابن عیینہ ابن جعفی سے بیس برس تو عمر میں بڑے تھے اور طبقۃً عالی امام محمد اور امام شافعی میں جس قدر جزئیات میں اختلاف ہی ظاہر ہی باایں ہمہ امام محمد جتنی امام شافعی کی تکریم کرتے تھے اُتنی کسی عالم کی نہیں کرتے تھے۔[3] امام بوشنجی کسی جنازے کی نماز پڑھانے تشریف لے گئے تھے جب واپس ہونے لگے تو امام ابوعمرو نے اُن کے گھوڑے کی باگ تھامی۔ امام ابن خزیمہ نے رکاب اور امام جارودی نے جارجامہ درست کیا۔[4] شیخ ابو اسحق شیرازی اپنے معاصر امام الحرمین سے ایک موقع پر یوں خطاب کر رہے تھے یامفید اہل المشرق والمغرب انت الیوم امام الائمۃ یعنی اے مشرق و مغرب کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے۔ آج تم سارے اماموں کے امام ہو۔[5] حق پسندی کی انتہا یہ ہوتی ہی کہ حاکم نیشاپوری محدث مشہور نے فن حدیث میں ایک کتاب المدخل فی الصحیح لکھی تھی امام عبدالغنی مصری نے اُس کا رد لکھا۔ حاکم نے جب یہ رد دیکھا تو امام مصری کی خدمت میں شکریے کا خط بھیجا اور اُن کے حق میں دعائے خیر کی۔[6] ذیل کی متفرق حکائتیں بھی ہمارے مدعا کو کسی نہ کسی پہلو سے ثابت کرتی ہیں۔ ابو اسحق شاعر مشہور نے

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۲ [2] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۰ [3] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۴۴ [4] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۳۰

[5] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۷ [6] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۵

جب وفات پائی تو شریف رضی نے مرثیہ لکھا۔ لوگ یہ سُن کر بگڑے اور کہا کہ افسوس ہے کہ خاندان نبوت سے ہو کر اُنھوں نے ایک صابی کا مرثیہ لکھنا روا سمجھا۔ شریف ممدوح نے یہ اعتراض سُنا تو فرمایا اور کیا خوب فرمایا انما رثیت فضلہ (میں نے تو اُس کے کمال کا مرثیہ لکھا ہے) الحق سے[1]

اِنَّمَا یَعرِفُ ذَا الفَضلِ
مِنَ النَّاسِ ذَوُوہ

حضرت سہل ابن عبد اللہ تستری امام ابو داؤد کے پاس (جن کی سنن داخل صحاح ستہ ہی) تشریف لے گئے۔ امام نے اُن کو اہلاً و سہلاً کہہ کر لیا اور تعظیم سے بٹھایا۔ جب حضرت ممدوح بیٹھ لئے تو امام موصوف سے فرمایا کہ میں ایک کام کے واسطے حاضر ہوا ہوں۔ ابو داؤد نے ارشاد کیا کہ فرمائیے۔ حضرت سہل نے کہا کہ جب تک یہ وعدہ نہ ہو جائے کہ حتی الامکان میری درخواست مقبول ہوگی میں نہ کہونگا۔ امام حدیث نے جب یہ منظور فرمالیا تو اُنھوں نے کہا کہ اپنی زبان جس سے احادیث نبویہ آپ نے روایت کی ہیں نکالیئے تاکہ میں اُس کو چوم لوں چنانچہ اُنھوں نے اپنی زبان نکالی اور اُنھوں نے چوم لی[2]۔ مبرد اور ثعلب ادب کے دو مشہور اماموں میں بوجہ معاصرت چشمک تھی۔ جب مبرد کے انتقال کی خبر سُنی تو ثعلب نے بہت تاسف کیا اور ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

ذَهَبَ المبردُ وانقضتْ ایامہ[3]	ولَیَذهَبَنَّ مع المبرد ثعلب
بیتٌ مِنَ الآدابِ اَضحیٰ نِصفُہٗ[4]	خَرِبًا وباقی النصف منہ سیخرب[5]
فتزودوا من ثعلب فبکاسِ ما	شَرِبَ المبردُ عَن قریب یشرب[6]

---

[1] ابن- ج ا- صفحہ ۱۳ [2] ابن- ج ا- صفحہ ۲۱۴ [3] مبرد گیا اور اُس کی زندگی کے دن گزر گئے ٭ مبرد کی رفاقت میں ثعلب بھی ضرور جائیگا ٭ [4] ادب کا گھر آدھا تو ویران ہو گیا ٭ [5] جو آدھا باقی ہے وہ بھی خراب ہوا چاہتا ہے ٭ [6] ثعلب کا دم غنیمت سمجھو کہ جو تلخ گھونٹ مبرد نے پیا ہے ثعلب بھی عنقریب پینے والا ہے [7] نزہۃ صفحہ ۲۹۳ و ۲۸۷

اُس زمانے کی حق پسندی کی ایک مثال خطیب بغدادی کے دفن سے متعلق ہی۔ خطیب کا وقت وفات جب قریب ہوا تو اُنھوں نے وصیت کی کہ میری قبر بشر حافی کے مزار کے قریب میں بنائی جائے۔ بعد وفات محدثین نے ہرچند تلاش کی مگر کوئی جگہ اُس با برکت قبر کے قریب نہ ملی صرف ایک لحد تھی جو صوفی ابن زہرا نے حالت حیات میں اپنے واسطے تیار کرائی تھی ہر ہفتہ ایک بار وہ اُس میں جا کر بیٹھتے اور کلام مجید ختم کرتے۔ جس گنج مزار کو اس محنت سے اُنھوں نے پاک بنانا چاہا تھا خطیب کے وصیوں نے آخر اُسی کو تاکا اور اُن سے استدعا کی۔ ظاہر ہی کہ یہ کب قبول کرتے۔ وہ بزرگ گروہ مایوس ہو کر اُن کے والد کے پاس گیا اور حال بیان کیا باپ نے بیٹے کو بلا بھیجا۔ جب یہ آئے تو کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ قبر دیدو۔ مگر ایک بات پوچھتا ہوں۔ فرض کرو کہ تم کسی موقعے پر بشر حافی کے پاس بیٹھے ہوتے اور خطیب وہاں آتے تو تم کیا پسند کرتے کہ خطیب تم سے پائیں میں بیٹھ جائیں۔ ابن زہرا نے کہا نہیں میں اپنی جگہ اُن کے واسطے خالی کر دیتا۔ نکتہ شناس باپ نے کہا کہ بس یہی معاملہ بعد رحلت ہونا چاہیے۔ صاف دل صوفی کے دل میں یہ بات اثر کر گئی اور اُنھوں نے وہ قبر بطیب خاطر دیدی۔[1] عفان ابن مسلم محدث انصاری کو ایک دفعہ دس ہزار[2] اشرفیاں اس غرض سے دی گئیں کہ فلاں شخص کی نسبت وہ قاضی کی عدالت میں جرح و تعدیل نہ کریں۔ مگر اُنھوں نے فرمایا کہ میں کسی کے حق کو باطل نہیں کر سکتا اور یہ کہہ کر اشرفیاں واپس کر دیں۔[3]

اپنے نفس کے مقابلے میں

یہ بیان عنوان حق پسندی کا اگرچہ آخری حصہ ہی لیکن اہمیت اور دشواری میں پچھلے دونوں بیانوں سے بڑھا ہوا ہی۔ برہنہ شمشیر کے مقابلے میں حق کو نہ چھوڑنا اتنا مشکل نہیں جتنا یہ مشکل ہی کہ انسان

---

[1] ابن خ ج ا صفحہ ۱۳ [2] ایک اشرفی اگر دس روپیہ کی رکھی جائے تو ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں ۱۲ [3] تذ ج ا صفحہ

اپنے نفس کی بُرائیاں ازراہ انصاف قبول کرلے یا آں کہ ایک شہرۂ آفاق باکمال اپنے ایک معاصر کے فضل وعلم سے اپنے علم وفضل کو کم مان لے۔ اولاد اور جان دنیا میں بہت عزیز چیزیں ہیں مگر جو اولاد نافرمان ہوجاتی ہے وہ دشمن سے زیادہ بُری معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور زندگی جب دل کو ستانے لگتی ہے یا کوئی حالت ایسی پیش آجاتی ہے جس کا نفس متحمل نہیں ہوسکتا تو انسان بے دھڑک اپنی حیات کا خاتمہ کردیتا ہے۔ تاریخ میں ایک ایسے جوانمرد پاشاہ کا ذکر ہے جس نے آٹھ ہزار فوج سے اسّی ہزار جرار فوج کے مونھ پھیر دیئے تھے اور اُس وقت اُس کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ لیکن یہ اولوالعزم فرماں روا اپنے نفس کے مقابلے میں ہمیشہ مغلوب رہا۔ یکے بعد دیگرے فاحش غلطیاں اُس نے کیں اُس کے مشیر سر دھنتے رہے مگر کبھی اُس سے یہ نہ ہوسکا کہ اپنی غلطیوں کو غلطی مان کر راہِ صواب اختیار کرلیتا۔ آفریں ہے اُن علمائے سلف پر جنھوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو قابو میں رکھا اور کبھی حق پر غالب نہیں ہوتے دیا فقہ کی کتابیں اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں کہ اُمت کے پیشوا اماموں نے کسی مسئلے میں اپنی رائے ایک ظاہر کی اور عقیدت کی مدد سے وہ مشرق ومغرب میں پھیل گئی اور سارے عالم میں اُس پر عمل ہونے لگا۔ پھر جب اُن کو اپنی رائے کی غلطی محسوس ہوئی تو علی الاعلان اُس کو چھوڑ دیا۔ اِس کی نظیریں بھی عرض کی جائیں گی کہ بڑے بڑے جلیل القدر اماموں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی کی ہے۔ ایسے بھی پاک نفس بندے تھے جو کسی فن یا علم میں مشہور روزگار ہوتے تھے اور جب اُن کے سامنے اُسی علم کا کوئی ایسا سوال پیش کیا جاتا جس کا جواب اُنھیں معلوم نہ ہوتا تو وہ بدون کسی پس وپیش کے رسائل سے فرما دیتے تھے لا ادری یعنی میں نہیں جانتا۔ امام شافعی جن کی رائے پر لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں نے اپنے دین و دنیا کو چھوڑ دیا ہے اپنی عقل ورائے کی نسبت یہ فرماتے ہیں ؎

کلما ادبنی الدھر اراني نقص عقلی ٭ واذا ما ازددت علماً زادنی علمی بجھلی

یہ باتیں کہنے کو تھوڑی اور چھوٹی ہیں مگر کرنے کو بڑی ہیں اور بہت بڑی۔ سلیمان ابن یسار فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس دونوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں حضرت ابن عمر اکثر سوالوں کے جواب میں لا ادری فرمادیتے تھے مگر حضرت ابن عباس کسی سائل کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اُن کو تعجب آتا تھا کہ عبداللہ ابن عمر کیوں لا ادری کہہ کر لوگوں کو ناکام واپس کردیتے ہیں۔ اور فرماتے تھے کہ جو مسالہ مشتبہ پیش آئے اُس میں اوّل تو سنت کو تلاش کرنا چاہیے اور اُس کے مطابق حکم دینا اور اگر صریح سنت نہ ہو تو اپنے اجتہاد سے مدد لیں۔ اتفاق زمانہ کہ ایک روز کوئی مسالہ اُن کے سامنے ایسا پیش ہوا جس کے جواب میں حضرت ممدوح متحیر رہ گئے۔ اُس وقت اُن کو اپنا وہ مقولہ یاد آیا جو حضرت ابن عمر کے مقابلے میں فرمایا کرتے تھے اور از راہ انصاف ارشاد کیا کہ البلاء[1] موکل بالقول[2] حدیث کے عالی مرتبہ امام شعبی بھی اکثر سوال کے وقت لا ادری کہہ دیتے تھے۔ اُن کا قول ہے کہ ہم فقیہ نہیں ہیں۔ ہم نے تو بس یہی کیا ہے کہ جو حدیث سُنی اس کو روایت کردیا۔ فقہا وہ ہیں جو علم پر عمل بھی کرتے ہیں[3]۔ جلیل القدر تابعی حضرت عطا کے پاس ایک روز ابن ابی لیلیٰ گئے تو حضرت عطا نے اُن سے بعض مسائل از راہ استفادہ دریافت کئے۔ جو لوگ اُن کی شانِ امامت سے واقف تھے اُن کو تعجب ہوا۔ کہ ابن ابی لیلیٰ سے عطا استفادہ کریں۔ حضرت عطا نے سُنا تو فرمایا کہ حیرت کیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ مجھ سے زیادہ عالم ہیں[4]۔ اُن بزرگوں کی پاک نفسی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اپنے شاگردوں کے مقابلے میں اپنے علم و کمال کو کمتر سمجھتے تھے۔ ابن عیینہ نے اپنے شاگرد علی ابن مدینی کی نسبت ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگو تم مجھ کو

---

[1] بولنا بلا میں ڈالتا ہے [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۳ [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۴۰ [4] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۵۴

ابن مدینی کے ارتباط پر ملامت کرتے ہو۔ واللہ وہ مجھ سے جتنا علم حاصل کرتے ہیں اُس سے زیادہ میں اُن سے سیکھ لیتا ہوں[۱]۔ یحییٰ ابن معین اپنے شاگرد امام ابن حنبل کی نسبت فرماتے ہیں کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد ابن حنبل کے ہو جاؤں۔ قسم ہے اپنے رب کی میں اُن کے مرتبے کو نہیں پا سکتا[۲]۔ حماد ابن زید کا اپنے معاصر شعبہ کے بارے میں یہ قول تھا کہ جب حدیث میں میری اور شعبہ کی رائے میں مخالفت آپڑتی ہے تو میں اپنی رائے چھوڑ کر شعبہ کا قول اختیار کر لیتا ہوں۔ اس لیے کہ شعبہ شیخ سے ایک حدیث بیس دفعہ سُن کر بھی سیر نہیں ہوتے تھے اور میں ایک بار کے سُن لینے پر قانع ہوں[۳]۔ امام شعبہ فرماتے تھے کہ سفیان احفظ منی یعنی سُفیان کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ اُن کے عہد میں اس فنِ پاک کا کمال حفظ پر موقوف تھا لہٰذا امام شعبہ کا حضرت سفیان کو اپنے آپ سے زیادہ حافظ حدیث بتانا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زیادہ عالم ہیں[۴]۔ امام اوزاعی شام کے مقتدا ایک روز امام فزاری کو خط لکھوانے لگے تو کاتب سے فرمایا کہ اول[۵] اُن کا نام لکھنا اس لئے کہ واللہ وہ مجھ سے بہتر ہیں[۶]۔ خواجہ حسن بصری نے کسی موقع پر بیان فرمایا تھا کہ منافق کو تین علامتوں سے پہچان لیا کرو۔ جب وہ بات کہے تو جھوٹ بولے۔ کسی کی امانت رکھے تو خیانت کرے۔ وعدہ کرے تو خلاف وعدگی کرے۔ حضرت عطا نے اُن کا یہ قول سُنا تو اعتراض کیا کہ حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں میں یہ تینوں صفتیں تھیں۔ انھوں نے جھوٹ بولا۔ امانت میں خیانت کی اور وعدہ خلافی بھی کی۔ بایں ہمہ خدا تعالےٰ نے اُن کو نبوت کا درجہ بخشا۔ لگانے والے تو بُرے ہوتے ہیں کسی نے حضرت عطا کا یہ اعتراض خواجہ صاحب کے کان ڈال دیا۔ پاک نفس خواجہ نے یہ سُن کر

---

۱ تذ۔ ج۲۔ صفحہ ۱۶ ۔ ۲ تذ۔ ج۲۔ صفحہ ۱۹ ۔ ۳ تذ۔ ج۱۔ صفحہ ۱۷۵ ۔ ۴ تذ۔ ج۱۔ صفحہ ۱۰۲ ۔ ۵ عربی میں خط کے آغاز میں لکھتے ہیں من فلاں۔ الیٰ فلاں یعنی فلاں شخص کی جانب سے فلاں شخص کو۔ ۶ تذ۔ ج۱۔ صفحہ ۲۴۹

ازراہِ انصاف فرمایا کہ وفوقؔ کُلّ ذی علم علیمؔ لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے امام ابوحنیفہ کی (جن کو دربارِ فضل سے امامِ اعظم کا خطاب ملا ہی) ایک ادنیٰ پیشہ ور حجام نے پانچ غلطیاں پکڑی تھیں۔ امام اعظم نے اُس حجام کی یہ قدر کی کہ اس واقعے کو خود سُنا کر قیامت تک اُس کا نام کردیا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایام حج میں میں نے ایک حجام سے حجامت بنوانے کا قصد کیا۔ جب میں اُس سے اُجرت ٹھہرانے لگا تو اُس نے کہا کہ مناسک کی اُجرت نہیں ٹھہرائی جاتی۔ اُس نے جب حجامت بنانی شروع کی تو میرا مونھ قبلے کی جانب نہ تھا۔ اُس پر حجام نے کہا کہ قبلہ رُخ ہو بیٹھو۔ میں نے بائیں طرف سے حجامت بنوانے کا ارادہ کیا تو بولا کہ حجامت سیدھی جانب سے اوّل بنوائی جاتی ہی۔ وہ اپنے کام میں مشغول تھا اور میں خاموش اُس پر اُس نے ہدایت کی کہ تکبیر پڑھتے جاؤ۔ حجامت سے فارغ ہو کر میں اُٹھ کر چلا تو میرے مہربان نے پوچھا کہ کہاں چلے۔ میں نے کہا کہ اپنی فرودگاہ پر جاتا ہوں۔ یہ سُن کر اُس نے کہا کہ اول دو رکعتیں پڑھ لو پھر قیام گاہ کا قصد کرنا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھا کہ یہ باتیں تم کو کس نے بتلائی ہیں۔ حجام نے جواب دیا کہ میں نے حضرت عطا کا طریق عمل ایسا ہی دیکھا تھا۔ ائمہ محدیث کے حالات میں اس کی مثالیں کثرت سے ہیں کہ جب اُن کے شاگرد شیخ بنے تو اُنھوں نے ان سے حدیثیں حاصل کیں۔ بلکہ محدثین کا یہ قول ہی کہ انسان اُس وقت تک محدث نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اعلیٰ۔ ہمسر اور کمتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے۔ بطور نمونہ ہم چند مثالیں ذیل کے نقشے میں لکھتے ہیں:

لہ ہر ذی علم سے بڑھ کر ایک عالم ہی۔

کہ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹

کہ وہ اعمال جو حج سے تعلق رکھتے ہیں

کہ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹

ھہ مقدمہ صفحہ ۵۰۵

نمبر	نام امام	نام شاگرد کا جس سے حدیث روایت کی	نمبر	نام امام	نام شاگرد کا جس سے حدیث روایت کی
۱	علقمہ	مقاتل (تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۱۵۷)	۵	ابو حنیفہ	ابراہیم ابن طہمان (تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۱۹۲)
۲	اعمش	سفیان ابن عیینہ (تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۲۳۹)	۶	لیث	عبداللہ ابن وہب (تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۲۷۰)
۳	ابن جریج	″	۷	بخاری	عبداللہ ابن حماد (مقدمہ صفحہ ۵۰۵)
۴	شعبہ	″	۸	خطیب بغدادی	ابن ماکولا (تذ۔ جلد ۴ صفحہ ۲)

احمد ابن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے اسحٰق ابن راہویہ کو یہ کہتے سنا کہ خدا تعالیٰ حق کو پسند فرماتا ہے لہذا میں کہتا ہوں کہ ابو عبید (بغدادی) مجھ سے علم میں بڑھ کر اور فقہ میں زیادہ۔ ہم ابو عبید کے محتاج ہیں مگر اُن کو ہماری احتیاج نہیں[۱]۔ جب سلیمان حافظ حدیث بغداد میں وارد ہوئے اور امام احمد ابن حنبل نے اُن کی آمد کی خبر سُنی تو حاضرین سے فرمایا کہ چلو سلیمان سے راویانِ حدیث کا پرکھنا سیکھیں[۲]۔ امام ممدوح اور سلیمان کی جلالتِ شان میں جو فرق بین تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ ایک عالم محمد کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ ابن معین کا یہ مقولہ سُنا تھا کہ ہم راویانِ حدیث پر جرح کر رہے ہیں حالانکہ ممکن ہے کہ وہی لوگ دو سو برس سے بہشت میں آسودہ ہوں۔ ایک روز میں ابن ابی حاتم کی خدمت میں گیا تو وہ فن رجال کا درس دے رہے تھے میں نے امام ممدوح کا قول مذکور اُن کو سُنایا۔ اُن پر اس مقولے کا یہ اثر ہوا کہ رونے لگے ہاتوں میں رعشہ آگیا اور کتاب ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ زار زار روتے تھے اور بار بار مجھ سے اس روایت کو کہلواتے تھے[۳]۔ ایام طالب علمی میں ایک روز امام دارقطنی ابن انباری کی مجلس درس میں شریک ہوئے دوران املا میں ابن انباری نے ایک نام میں غلطی کی۔ دارقطنی کو اتنی جسارت تو نہ ہوئی کہ ابن انباری کو متنبہ کرتے مگر اُن کے متملی کو وہ غلطی جتادی۔ جب دوسرے جمعے کو دارقطنی پھر مجلس مذکور میں گئے تو ابن انباری نے باعلان فرمایا کہ ہم نے اُس روز فلاں نام میں غلطی کی تھی اس نوجوان

---

[۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۷ [۲] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۷ [۳] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۵۰

نے ہم کو آگاہ کردیا[1]۔ جوشِ حق پسندی اس کو کہتے ہیں۔ اگر ابن انباری اس راز کو فاش نہ کرتے تو شاید دنیا کو اس کی خبر بھی نہوتی۔ مگر اُنھوں نے یہ خیال فرمایا کہ اپنی ایک خطا ظاہر ہوجائے تو مضائقہ نہیں جو نوجوان طالب علم دل بڑہائے جانے کا مستحق ہی اُس کی حق تلفی نہونی چاہیئے حافظ ابن خیرون کو کسی نے حافظ لکھا تو وہ بگڑ گئے اور فرمایا کہ میری کیا ہستی ہی جو مجھ کو حافظ لکھا جائے[2]۔ آج کل کے محمد فاضل اپنے نام کے اوّل میں مولوی لکھا دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ حق بحقدار رسید۔ آلِ سلجوق کے بلند پایہ وزیر نظام الملک طوسی نے جو نظامیہ مدرسہ بغداد میں قایم کیا تھا اُس میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی اور امام حجۃ الاسلام غزالی جیسے اکابر مدرس رہے تھے۔ فخر الاسلام شافعی جب اُس کے مدرس مقرر ہوئے تو پہلے روز مسند تدریس پر متمکن ہونے کے بعد اُن اکابر کا خیال آیا جو اُس مسند کی عزت بڑہا چکے تھے۔ اس تصوّر نے اُن کے پاکیزہ قلب پر ایک کیفیت طاری کردی۔ عمامہ آنکھوں پر رکھ کر بے اختیار روئے اور یہ شعر پڑہا[3]

خلت الدیار فسدت غیر مسود ومن العناء تفردی بالسود

یعنی ملک اہلِ کمال سے خالی ہوگیا اور میں جو شایانِ سرگروہی نہ تھا۔ سرگروہ بنا۔ میرا سرگروہ یگانہ بننا کیسا اندوہ افزا ہی[4]۔ ادب عربی میں جو مرتبہ اصمعی کا ہی اُس سے ایک زمانہ واقف ہی باوجود کلام عرب کے دقائق سے واقف ہونے کے یہ امامِ ادب کلام اللہ اور حدیث کے معنی بیان کرنے سے بہت بچتا تھا۔ جب اس قسم کا سوال کیا جاتا تو اصمعی جواب دیتا کہ عرب اس لفظ کے یہ معنی لیتے ہیں مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ کتاب و سنت میں کون سے معنی مُراد ہیں[5]۔ امام ادب ابو العباس ثعلب کے پاس ایک شخص آیا اور کسی علمی مسئلہ کا جواب چاہا۔ ثعلب کو چونکہ وہ مسئلہ معلوم نہ تھا

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۶ [2] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۰ [3] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۶ [4] ابن۔ ج ا صفحہ ۲۸۹ [5] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۳۰

اس لیے جواب میں لا ادری کہہ دیا۔ وہ بیچارہ اس اُمید پر آیا تھا کہ اُن کے پاس مشکل حل ہو جائیگی یہاں جو یہ صاف جواب سُنا تو بہت جھنجھلایا اور کہا کہ حضور کی یہ تو شہرت ہے کہ لوگ سفر کر کے حاضر ہوتے ہیں۔ اور علم کا یہ حال ہے کہ ایک ذرا سے سوال کے جواب میں لا ادری ارشاد ہوتا ہے۔ ثعلب نے از راہ ظرافت کہا کہ میرے پاس جتنی لا ادریاں ہیں اگر تمھارے پاس اتنے اونٹ ہوتے تو تم بڑے مالدار ہو جاتے[۱]۔ متنبی مشہور شاعر کا واقعۂ قتل اس بات کی کہ اُن دنوں سچی بات دلوں پر کیا اثر کرتی تھی ایک بے نظیر مثال ہے۔ شاعر مذکور اپنے وطن کوفہ کو واپس آرہا تھا۔ بغداد کے سواد میں پہنچا تو خوں خوار قزاقوں نے حملہ کیا۔ اوّل تو متنبی مع رفقا کے خوب لڑا مگر پھر جان بچا کر بھاگا۔ اُس کے دلیر غلام نے آقا کو بھاگتا دیکھ کر کہا کہ جس شخص کا یہ شعر ہو حیف ہے کہ لوگ اُس کی نسبت بھاگنے کا تذکرہ زبان پر لائیں ؎

فالخیلُ واللیلُ والبیداءُ تعرفنی　　　والحربُ والضربُ والقرطاسُ والقلمُ[۲]

متنبی یہ سُن کر میدان کی طرف لوٹ پڑا اور آتا لڑا کہ اُسی جگہ کام آگیا[۳]۔ ابو العلاء اور ابن اسحٰق دونوں فن ادب کے مشہور امام تھے۔ ایک بار نحو کے علم میں اُن میں باہم مناظرہ ہوا تھا کسی موقع پر ابو العلاء نے یونس نحوی سے اس مناظرہ کا تذکرہ کیا تو صاف دلی سے اعتراف کیا کہ اُس مناظرے میں ابن ابی اسحٰق قاعدۂ ہمزہ میں مجھ پر غالب آگئے تھے۔ اس فصل پر میں نے بعد کو غور کیا ہے[۴]۔ ابو زید انصاری سے کسی نے پوچھا کہ فلاں موقع پر تم مخردق بولتے ہو اور ابو عمرو مخرزق صحیح کون سا لفظ ہے۔ ابو زید نے کہا کہ چونکہ ابو عمرو کی والدہ نبطی ہے اور یہ لُغت بھی نبطی ہے اس لیے ابو عمرو کا قول زیادہ مستند ہے[۵]۔ شعرا اپنی بد دماغی اور بے نیازی

---

[۱] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۰ [۲] گھوڑا۔ رات جنگل۔ حرب و ضرب اور کاغذ و قلم یہ سب مجھ کو خوب پہچانتے ہیں
[۳] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۱ [۴] نزہۃ۔ صفحہ ۲۳ [۵] نزہۃ۔ صفحہ ۱۲۴

میں ضرب المثل ہیں۔ اُن کی نازک مزاجی دوسروں کے کمال کے سامنے سر جھکانے کو گوارا نہیں کرتی جس قرن کا ذکر ہم کر رہے ہیں اُس کے اثر نے شاعروں کو بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا۔ ابو العتاہیہ ایک دفعہ اپنے معاصر بشار سے ملنے گئے اور اثنائے کلام میں بشار سے کہا کہ تمہارے یہ شعر اعتذار بکا میں مجھ کو نہایت پسند ہیں ؎

کم صدیق لی اسا | رقه البکاء من الحیاء
واذا تفطن لامنی | فاقول مالی من بکاء
لکن ذهب لاردی | فطرفت عینی بالرداء

بشار نے کہا کہ اس مضمون میں تقدم کا شرف آپ کو حاصل ہے اور میں کاسہ لیس ہوں میرا شعر آپ ہی کی دریا کا قطرہ ہے۔ چنانچہ آپ نے کہا ہے ؎

فقالوا قد بکیت فقلت کلا | وهل تبکی من الجزع الجلید
ولکن قد اصاب سواد عینی | عوید قذی له طرف حدید
فقالوا ما لدمعهما سواء | اکلتا مقلتیک اصاب عود[1]

ایک روز مولانا شمس الدین رومی سے کسی نے کہا کہ شیخ ابن الوفا مولانا خسرو کے پاس تو جاتے ہیں مگر آپ کے پاس نہیں آتے مولانا نے جواب دیا کہ حق بجانب شیخ کے ہے۔ مولانا خسرو عالم باعمل ہیں اس لیئے قابل زیارت ہیں۔ میں نے اگرچہ علم پڑھا ہے مگر سلاطین کی صحبت میں بیٹھتا ہوں اس لیے قابلِ زیارت نہیں رہا[2]۔

---

[1] (ابن۔ ج ۱۔ ص ۷۳)، [2] (دق ج ۱ ص ۹۴)

عنوانِ سوم

اختلاف و اتفاق

اِس عنوان کے قایم کرنے سے ہمارا مقصود یہ عیاں کرنا ہی کہ علمائے سلف کا اُن عالموں کے مقابلے میں کیا عمل رہا ہی جو اُن سے عقائد یا جزئیات مسائل میں مخالف تھے زیادہ صاف الفاظ میں یہ سمجھئے کہ علمائے اہلِ سُنت وجماعت کا سلوک دوسرے اہلِ قبلہ (مثلاً شیعہ وخارجی ومرجیہ وقدری) علما کے ساتھ کیسا تھا اور خود اہلِ سنت وجماعت کے مختلف فرقوں کے علما کس قسم کا برتاؤ باہم رکھتے تھے۔ آیا عقائد کا اختلاف ایسی حدفاصل خیال کیا جاتا تھا جو ایک کو دوسرے کی صورت سے بیزار۔ اُس کی خوبیوں کا منکر! اور اُس کے ساتھ ارتباط کو ایمان میں خلل انداز سمجھنے والا بنا دیتا۔ یا آں کہ وہ روا رت عقیدہ کو بُرا سمجھ لینے بعد اُن کو ثقہ وصالح جانتے۔ اُن سے احادیث روایت کرتے اور اُن کے علم وفضل کے حاضر وغائب عقیدتمند رہتے تھے۔ یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہی کہ سچا اسلامی جوش اور خالص دینی حمیت قرونِ خیر پر ختم تھی۔ اور نبوت کے عہدِ پاک کے قرب کی وجہ سے جو آثار صلاح ورشاد ابتدائی صدیوں میں تھے وہ بعد کو باقی نہیں رہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اسی وجہ سے اُن بزرگوں کے طریقے اور مسلک کو عین صراطِ مستقیم اور ٹھیک راہ دین مانا جاتا ہے۔ پس ہمارا حال وخیال اگر سلف صالحین کے حال وخیال کے خلاف ہی تو ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم راہ صواب سے دُور جا پڑے ہیں۔ یہ بات طریقۂ حق سے بعید ہو گی کہ ہم اُن کے شیوے

کو اپنے مسلک کے مخالف دیکھ کر از راہِ تعصب خلاف حق سمجھیں اور اپنے ہی خیال باطل کو عین دین داری تصور کریں ہم نے اس باب میں یا تو تابعین و تبع تابعین کے اقوال و افعال کا حوالہ دیا ہی یا اُن علمائے مابعد کے اقوال و افعال کا جو بالاتفاق پیشوائے ملت مانے گئے ہیں اور مزید احتیاط یہ کی ہی کہ یہ حالات اور اقوال بھی صرف بحوالہ امام ذہبی نقل کئے ہیں جو فن رجال و اسانید کے مستند امام شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ بحوالہ کشف الاسرار البتہ نقل کیا ہی۔ اصل مبحث پر بحث کرنے سے پیشتر یہ دیکھنا مناسب ہو گا کہ اگلے علمائے ربانی مذہبی جھگڑوں اور دینی نزاعوں کو کیسا خیال فرماتے تھے۔ آیا اُن کو تمام اُصول دین اور ارکان مذہب سے زیادہ مہتم بالشان اور لائق اہتمام سمجھتے تھے یا اُن کو نفرت کی نظر سے ملاحظہ فرماتے اور بربادی و تباہی کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ذیل کے اقوال صاف صاف ثابت کر دیں گے کہ وہ قدسی گروہ ہمیشہ اُن سے بیزار رہا۔ امام ششم حضرت جعفر صادق ارشاد فرماتے ہیں ایاکم والخصومة فی الدین فانها تشغل القلب و تورث النفاق یعنی بچو دین میں جھگڑا کرنے سے اس واسطے کہ وہ دل کو کام کی باتوں سے باز رکھتا ہی اور نفاق پیدا کر دیتا ہی

صدقت یا ابن رسول اللہ جس بات سے بارہ سو برس پیشتر امام روشن ضمیر نے مسلمانوں کو ڈرایا تھا۔ آج اُس کے دردناک نتیجے اہلِ دین کے سامنے ہیں۔ اگر اس مقولے پر عمل رہتا تو مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے شرمناک صفحے نہ لکھے جاتے! امام اعظم فرماتے ہیں کہ مجھ کو علم کلام میں عجب ملکہ عطا فرمایا گیا تھا۔ اور ایک زمانہ دراز تک میرا یہی مشغلہ رہا۔ چونکہ شہر بصرہ اس قسم کے مباحثہ کرنے والوں کا مرکز تھا اس لئے میں بیس دفعہ سے زیادہ وہاں گیا اور کبھی ایک برس اور کبھی اس سے کم کبھی اس سے زائد وہاں مقیم رہا۔ معتزلہ اور خوارج وغیرہ کل فرقوں سے میرے مباحثے رہے اور الحمد للہ میں نے سب کو مغلوب کیا۔ بعض خاص فرقوں کا کوفے

میں مجمع تھا اُن سے میں وُہاں بحث کرتا اور غالب آتا۔ اُس زمانے میں علم کلام کو میں سب علوم سے افضل و اعلیٰ سمجھتا تھا۔ جب میری عمر کا ایک حصّہ اس میں صرف ہو چکا تو میں نے ایک دفعہ دل میں کہا اور سوچا کہ صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین ہم سے زیادہ ان باتوں کو سمجھنے اور جاننے والے تھے اور حقائق امور کو ہم سے زیادہ پہچانتے تھے مگر اُنھوں نے کبھی اِن باتوں میں جھگڑا اور خوض نہیں کیا بلکہ اس سے خود باز رہے اور دوسروں کو شدت کے ساتھ منع کیا۔ میں نے اُن کا غور و خوض شریعت کے معاملات اور فقہ کے مسائل میں پایا۔ اُنھیں میں وہ بحث کرتے تھے اور اسی کی ترغیب دیتے تھے۔ سلف کا دورِ اوّل اسی پر ختم ہو گیا۔ تابعین نے اسی خصلت کی پیروی کی۔ اِن بزرگوں کے اِن حالات کا انکشاف ہوتے ہی میں نے منازعت اور علم کلام میں غور و خوض کرنا چھوڑ دیا اور سلفِ صالحین کے طریقے کو اختیار کرکے وہی کام کرنے شروع کئے جو وہ کرتے تھے۔ اور ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ علم کلام کے مدعی ہیں اور اُس میں جھگڑتے ہیں اُن کی شان سلف کی شان کے اُن کا طریقہ سلف کے طریقے کے خلاف ہی۔ میں نے اُن کے قلوب میں قساوت اور دلوں میں شدت پائی وہ کتاب و سُنّت اور سلف صالحین کی مخالفت کی پروا نہیں کرتے یہ دیکھ کر میں نے اُن کو چھوڑ دیا۔ اور اس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ انتہیٰ خلاصۃً (کشف جلد اوّل صفحہ ۹ و ۱۰) یہ دوسری صدی کے مناظرے اور مناظرین کا حال تھا۔ آج کل کے مناظرے اور مناظرہ کرنے والوں کے حال کا قیاس اسی پر فرما لیجئے۔ شام کے مقتدا امام اوزاعی کا (جو تبع تابعی ہیں) قول ہی کہ اذا اراد اللّٰہ بقوم شرًا فتح علیھم الجدل ومنع عنھم العمل یعنی جب کسی قوم کی بربادی خدا تعالیٰ کو منظور ہوتی ہی تو اُن پر جھگڑے کے دروازے کھول دیتا ہی اور عمل سے باز رکھتا ہی۔

مطلب یہ کہ جب تم دیکھو کہ ایک قوم جھگڑنے میں بہت چست ہی اور عمل میں سست تو سمجھ لو کہ خدا کی بھیجی ہوئی تباہی اُس پر آرہی ہی۔ ایک دوسرے تبع تابعی امام حجاج ابن ارطاۃ فرماتے ہیں کہ ماخاصمت قط ولا جلست الی قوم یختصمون یعنی میں نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا اور نہ کبھی ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا جو جھگڑالو ہوں! اس قول سے پتا لگتا ہی کہ امام حجاج کے نزدیک کسی شخص یا فرقے سے بیزار اور اُن کی مجالست سے متنفر کر دینے والی کیا صفت ہو سکتی ہے۔ آپ اگر اس مقولے کو آیندہ کے واقعات سے ملائیں گے تو ایک اہم نتیجہ حاصل ہوگا ان اقوال کو پڑھ کر ایک خلجان طبیعت کو پیدا ہوتا ہی کہ یہ بات واضح طور پر ثابت ہی کہ ائمۂ دین نے ہمیشہ طریقۂ باطل کی تردید اور راہ صواب کی تائید فرمائی ہی۔ اور اُن کے مناظرے معتزلہ وغیرہ فرقوں کے علما کے ساتھ تاریخ وفن کلام میں مذکور ہیں۔ پھر کیونکر مذہبی مباحثوں کو مورثِ نفاق اور باعثِ بربادی کہا جا سکتا ہی۔ اس شبہے میں ایک افسوس ناک خلط مبحث ہی اور وہ یہ ہے کہ اختلاف وخصومت میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اور ہم علمای سلف کے اختلاف کو اپنی نزاعوں پر قیاس کرتے ہیں۔

حضرت یحییٰ ابن سعید جو اکابر تابعین میں ہیں کس خوبی سے اختلاف ونزاع کا امتیاز ظاہر فرماتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہی کہ اھل العلم اھل توسعة وما برح المفتون یختلفون فیحلل ھذا ویحرم ھذا فلا یعیب ھذا علی ھذا یعنی علما اہل وسعت ہیں۔ اور مفتی ہمیشہ باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک چیز کو حلال بتلاتا ہی دوسرا اسی کو حرام کہتا ہی۔ مگر یہ اُس کی عیب گیری نہیں کرتا اور وہ اس کی۔ اس مقولے میں جہاں تک کہ میری فہم ناقص میں آیا ہی ویحرم ھذا تک اختلاف کی حد ہی اس کے بعد جدل و

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۴

خصومت کا بیان ہی۔ قول ہذا میں تین پہلو دکھلائے گئے ہیں۔ سب سے اوّل گروہ علما کی یہ صفت بیان کی ہی کہ اُن کے خیالات وسیع ہوتے ہیں۔ اُس کے بعد یہ تبلایا ہی کہ اُن میں باہم اختلاف ہوتا رہا۔ اور پھر یہ جتایا ہی کہ اُن کا اختلاف باوجود اپنی سنگینی کے عیب گیری کی حد تک نہیں پہنچا میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ جو اختلاف کشادہ دلی کے ساتھ بے شائبۂ عیب گیری ہو وہ سلف صالحین کا طریقہ ہی اور اسی کو رحمت فرمایا ہی۔ اور جو بحث تنگ دلی اور عیب گیری کے پیرائے میں ہو وہ خصومت ہی اور اسی سے بچنے کی تاکید ائمۂ ہدیٰ نے فرمائی ہی۔ آج کل مسلمانوں میں جو مباحثے ہو رہے ہیں اُن کو اسی معیار کے بموجب پرکھنا چاہیے اور جس قسم میں وہ داخل ہوں ہی کے احکام اُن پر جاری کیے جائیں۔ جزئیات مسائل کا اختلاف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے رسالۂ انصاف میں یہ اختلاف اور اس کے اسباب کسی قدر بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں ہم اُس کی چند مثالیں جو طبقات الحفاظ میں نظر پڑیں یہاں درج کرتے ہیں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ آں حضرتؐ سے احادیث کم روایت کی جائیں۔ بعض صحابیوں کا مسلک اس کے خلاف تھا۔ اسی اختلاف کی وجہ سے خلیفۂ ثانی نے تین جلیل القدر صحابہ حضرت ابن مسعود ابو الدرداء اور ابو مسعود کو نظربند رکھا اور فرمایا کہ تم نے آں حضرت سے حدیثیں بہت روایت کر دیں[۱]۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ خلیفۂ ثانی حضرت اُبی کی بہت تکریم کرتے تھے اُن سے ضرورت کے وقت فتویٰ لیتے بلکہ اُن کی ہیبت مانتے۔ باوجود اس کے صحابی ممدوح کے ہمراہ ایک جماعت دیکھ کر ان کے مارنے کو درہ اُٹھایا۔ حضرت اُبی نے کہا دیکھو کیا کرتے ہو۔ خدا تم پر رحم کرے۔ امیر المومنین نے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ یہ

---

[۱] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ

جماعت سرگروہ کے لیے باعث فتنہ اور تابع کے واسطے موجب قلت ہے[۱]۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت ابوذر کو فتویٰ دینے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی برس زندہ رہے اور ۳۲ھ میں بمقام ربذہ انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ[۲]۔ کیا اس بیان کی حاجت ہے کہ صحابۂ کرام میں ان جزئی اختلافات کے ساتھ اتفاق کیسا تھا۔ تابعین کے زمانے میں اختلافِ عقائد بھی شروع ہوگیا تھا۔ اور معتزلہ و قدریہ وغیرہ فرقے پیدا ہوگئے تھے۔ اُس عہد میں بہت سے اسلامیہ فرقے ایسے موجود ہوگئے تھے جن کا اب نام و نشان بھی نہیں اور صرف کتابوں میں ذکر رہ گیا ہے۔ اُس دورِ پاک میں مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے اور جو کام وہ کرتے تھے اُس میں جوش و ہمت کا پورا جلوہ ہوتا تھا۔ اِس لئے یہ تازہ وارد فرقے بھی اپنے عقائد کی اشاعت میں پوری کوشش و سعی سے کام لے رہے تھے۔ ہمارے علمائے کرام اِدھر تو ملت حقّہ کی حفاظت و حمایت میں جان لڑا رہے تھے۔ اُدھر انھیں مخالف العقیدہ علما کی مرتبہ دانی اور حق شناسی میں نہایت کشادہ دلی سے مصروف تھے اُن کے حالات پڑھ کر اس کشادہ دلی کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی تین قسم کے دلائل سے ہم اپنے اس دعوے کو ثابت کرسکتے ہیں۔ اوّلاً علمائے ممدوح نے اُن سے علم دین حاصل کیا اور اُن کو روایت حدیث کا اہل سمجھا۔ حضرت قتادہ کی جو جلالت شان حدیث میں ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث اُن کے شاگرد ہوئے ہیں۔ عقیدۃً وہ قدری[۳] شدید تھے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ باوجود اُن کے اس عقیدۂ ردی کے کسی نے اُن کی روایت کو مستند ماننے میں پس و پیش نہیں کیا[۴]۔ امام مغیرہ تابعی عثمانی تھے اور حضرت خلیفۂ چہارم پر گونہ معترض۔ تاہم شعبہ اور ابو عوانہ

۱ تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۷، و ۱۵۔ ۲ تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۶۔ ۳ فرقۂ قدریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے افعال خیر و شر کا خالق و قادر ہے۔ (الملل والنحل) ۴ تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۰

وغیرہ جلیل الشان اماموں نے اُن سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ امام احمد اُن کی نسبت فرماتے ہیں صاحب سنۃ اور احمد عجلی نے اُن کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہے[1]۔ عمرو ابن مرۃ تابعی کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مرجیہ[2] تھے[3]۔ پھر بھی ایک جماعت نے اُن کی توثیق کی ہے[4]۔ ہشام دستوائی قدری تھے۔ امام ابن سعد اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کان ثقۃ وحجۃ الا انہ یری القدر (یعنی وہ ثقہ اور حجت تو تھے مگر قدری تھے)[5] سعید ابن عروبہ بھی فرقہ قدریہ میں سے تھے فن رجال کے دو مشہور عالی درجہ اماموں نے اُن کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہے۔ یعنی حضرت یحییٰ ابن معین اور امام نسائی نے[6]۔ حافظ ابونعیم فرماتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا مگر حسن ابن صالح سے افضل کسی کو نہیں پایا۔ اُن کے عقیدے کی نسبت امام ذہبی فرماتے ہیں کان فیہ خارجیۃ یعنی اُن میں خارجیت تھی[7]۔ امام ابوسہل واسطی شیعی تھے اور اسی جرم میں خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کو قید کر دیا تھا۔ امام ذہبی اُن کے احوال میں تحریر کرتے ہیں متفق علی الاحتجاج بہ یعنی اُن کے حجت ہونے پر سب کو اتفاق ہے[8]۔ محمد ابن فضیل کوفی بھی شیعی تھے۔ حضرت یحییٰ ابن معین نے اُن کی توثیق فرمائی ہے۔ اور امام احمد اُن کی نسبت فرماتے ہیں حسن الحدیث شیعی[9] حافظ حدیث ابو معمر قدری تھے۔ اس پر بھی امام بخاری نے اُن سے حدیث روایت کی ہے[10]۔ عبداللہ ابن موسیٰ فرقہ شیعہ کے علمائے کبار میں تھے اُن سے بھی امام بخاری نے روایت فرمائی ہے[11]۔ ابن الاخرم امام شعرانی کے بارے میں فرماتے ہیں۔ صدوق غال فی التشیع یعنی سچے ہیں اور تشیع میں غالی[12]۔ شیخ الاسلام انصاری ایک جلیل القدر

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۰ [2] فرقہ مرجیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ایمان کی حالت میں کوئی معصیت مضر نہیں جیسے کفر میں طاعت مفید نہیں ۱۲ الملل والنحل [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۰۰ [4] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۴۰ [5] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۰ [6] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۹۵ [7] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۰ [8] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۰۰ [9] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱ [10] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۴ [11] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۲

امام حدیث کی نسبت اپنی رائے جن الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں وہ قابل شنید ہیں ثقۃ فی الحدیث۔ رافضی خبیث[1] یعنی حدیث میں ثقہ رافضی خبیث ہیں۔ حضرت یحیی ابن معین اس مرحلے کو انتہا تک پہنچاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ لو ارتد عبدالرزاق ماترکنا حدیثہ[2] یعنی اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں تو بھی ہم اُن کی روایت کردہ حدیث کو نہ چھوڑیں گے! ان اقوال و افعال کا آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ علمائے مخالف العقیدہ خواہ قدری تھے خواہ خارجی۔ مرجیہ تھے یا شیعہ۔ کبار علمائے شیعہ میں سے تھے۔ یا شیعۂ غالی و رافضی خبیث مگر جب اُن کو ہمارے علمائے کرام نے ثقہ۔ حجت صدوق۔ صاحب سنت اور اہل فضل پایا تو اُن کو ایسا ہی کہا اور ایسا ہی مانا اور اُن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو آنکھوں سے لگایا اور دل میں رکھا۔ ہم تو حیرت میں ہیں کہ ایک شخص کو رافضی خبیث کہیں اور پھر ثقہ بتائیں۔ یہ ضدیں کیونکر جمع ہوئیں۔ اور دوسرے شخص کو یہ فرض کر کے بعد بھی کہ وہ مرتد ہو جائے اس کی روایت کردہ احادیث کے ترک کرنے کو گوارا نہ فرمائیں۔ یہ مشرق و مغرب کا اجتماع کیسا۔ سچ یہ ہے کہ یہ معما چودھویں صدی میں حل ہونا بے حد دشوار ہے اس کے حل کرنے والے وہی بزرگ تھے جن کی قوتِ ایمانی نے اُن کے قلوب کو تعصب سے پاک اور حق کا شیدا بنا دیا تھا۔ ثانیاً اُن کے فضل و کمال کی یہ تعظیم کی کہ حضرت عکرمہ (جن کا عقیدہ خوارج کی جانب مائل تھا) جب بصرے تشریف لے جاتے، تو حضرت خواجہ حسن بصری فتوی دینے اور درس تفسیر سے دست کشیدہ ہو جاتے اور جب تک اُن کا وہاں قیام رہتا خواجہ صاحب اسی برتاؤ کو قائم رکھتے[3]۔ ثالثاً علوم ظاہر سے گزر کر اُن کی روحانی عظمت کا اعتراف کیا! امام ابراہیم ابن طہمان (جن سے امام اعظم نے سماعت حدیث کی تھی) عقیدے کے مرجیۂ شدید تھے! ایک روز کا ذکر ہے کہ امام احمد ابن حنبل بوجہ ضعف علالت تکئے کے سہارے سے بیٹھے تھے۔ اس اثنا

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۴۲ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۴۳ [3] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۸۳

میں کسی نے ابن طہمان کا تذکرہ چھیڑا! امام ربانی یہ سنتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ جس مجلس میں صلحا کا ذکر ہو اُس میں تکیہ لگا کر بیٹھنا روا نہیں[۵]۔ خداوندا ایسے پاک مشرب بزرگ اب کیوں نہیں پیدا ہوتے!! منصور ابن زادان جلیل القدر تابعی تھے۔ امام ذہبی نے اُن کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہی کان ثقۃ حجۃ صالحاً کبیر الشان جب حضرت خواجہ حسن بصری نے رحلت فرمائی تو تابعی ممدوح نے علی ابن زید سے (جو شیعہ تھے) فرمایا کہ تم حسن کی جگہ بیٹھو[۵] اِس موقع پر اگر یہ غور سے دیکھا جائے کہ حضرت حسن بصری کی جگہ کیا جگہ تھی تو اس واقعے کی قوت انتہا کو پہنچتی ہی۔

اس بحث میں اب صرف ایک امر فیصلہ طلب باقی ہی۔ وہ یہ کہ آیا ان فرقوں میں عقیدے کی سختی اور شدت اس عہد میں اسی حالت میں تھی جیسی آج ہی یا بجائے سختی کے اعتدال تھا ضمنی طور پر اوپر کی بعض جرحوں کے الفاظ سے سختی کا پتہ لگتا ہی۔ لیکن ہم واقعات کی مدد سے بالتصریح ثابت کرنا چاہتے ہیں شیعیت میں جو سخت سے سخت بدعت ہی وہ شتم صحابہ ہی۔ معاذ اللہ من ذالک دوسری صدی ہجری میں یہ ناسزا طریقہ اس فرقے میں رائج ہو گیا تھا اور عوام میں نہیں بلکہ خواص میں۔ چنانچہ لکھا ہی کہ شیخ حدیث ابوالاحوص کا مکان جب محدثین سے بھر جاتا تو وہ اپنے بیٹے سے فرماتے کہ دیکھو ان میں جو شتم صحابہ کرتا ہو اُس کو نکال دو (وفات ابوالاحوص ۱۷۹ھ[۳]) اسی عہد میں قدریت بھی سنگین پیرایہ اختیار کر چکی تھی۔ امام ابواسحٰق فزاری جب دمشق میں آئے تو ابوالمسہر سے فرمایا کہ کہہ دو کہ جو قدری ہو ہماری محفل سے چلا جائے (وفات ابو اسحٰق ۱۸۸ھ[۴]) ان دونوں واقعوں سے معترضین کچھ نفع نہیں اُٹھا سکتے۔ اس لئے کہ جن بزرگوں کے اقوال و حالات سے ہم نے استدلال کیا ہی اُن کے مقابلے میں امام ابوالاحوص و ابواسحٰق کی رائے فروغ نہیں پا سکتی۔

---

[۱] تذ ج ۱ صفحہ ۱۹۲ [۲] تذ ج ۱ صفحہ ۱۲۶ [۳] تذ ج ۱ صفحہ ۲۲۰ [۴] تذ ج ۱ صفحہ ۲۴۰

اختلاف عقائد کی صورت میں جب ہمارے علما نے اپنے مخالفین سے حسنِ سلوک پیش نظر رکھا تو ظاہر ہی کہ اختلافِ جزئیات مسائل اُن کے مزاجوں پر کب مؤثر ہو سکتا تھا اور اس لیے اس قسم کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہم تذکرۃً چند حالات گزارش کرتے ہیں۔ آج کل خود اہل سنت و جماعت کے مختلف فرقے باہم ایسا ہی اختلاف اور شدت کا برتاؤ کر رہی ہیں جیسا کہ وہ خلاف اہل سنت فرقوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ پس یہ چند مثالیں بھی خالی از نفع نہ ہونگی۔ امام قدروی حنفی اور شیخ ابو حامد اسفرائنی شافعی کے مابین ہمیشہ مناظرہ رہتا تھا۔ مگر شیخ شافعی کا فضل و کمال امام حنفی کی نظروں میں سمایا ہوا تھا اور اس لئے وہ اُن کی نہایت تعظیم کرتے تھے[۱]۔ فقیہہ عماد الدین شافعی اور قاضی القضاۃ ابو طالب زینبی حنفی آپس میں سخت مخالف تھے۔ شافعی فقیہ کو پیام اجل قاضی القضاۃ سے پہلے آگیا۔ چونکہ ابو طالب کا ایک مخالف دنیا سے کم ہو گیا۔ اس لیے اُن کو بظاہر خوشی کا موقع تھا۔ لیکن جب زینبی اُن کے دفن سے فارغ ہوئے۔ تو اُن کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر یہ حسرت ناک شعر پڑھا ؎

عقم النساء فلا تلدن شبیہہ   ان النساء بمثلہ عقم

خواجہ حسن بصری اور امام ابن سیرین میں باہم کسی وجہ سے بدمزگی ہو گئی تھی۔ اسی لیے لطفی کے سبب سے امام ابن سیرین خواجہ صاحب کے جنازے کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے۔ ایک روز کسی شخص نے آکر اُن سے بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہی کہ ایک جانور مسجد کا سب سے زیادہ خوشنما سنگریزہ اُٹھالے گیا۔ ابن سیرین نے فرمایا کہ تیرا یہ خواب سچا ہی تو حسن بصری کی وفات قریب ہی چنانچہ چند ہی روز کے بعد اس سرگروہ اصفیا نے وفات پائی[۲]۔ اس واقعے سے یہ ظاہر کرنا ہی کہ باوجود اس قدر کشیدگی کے امام ابن سیرین نے خانۂ خدا کا نفیس سنگریزہ

---

[۱] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۰ [۲] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۹

خواجہ صاحب ہی کو بتایا اس بحث میں ہم ایک پُر مذاق قصہ نقل کرتے ہیں۔ اخفش امام نحو اور ابن رومی شاعر مشہور کے مابین خشمک ہو گئی تھی۔ ابن رومی بہت ضعیف الاعتقاد تھا۔ اور بدشگونی سے بہت ڈرتا تھا۔ اخفش کبھی کبھی اُس کے دروازے پر علی الصباح پہنچتا اور کچھ نحس کلمے کہہ کر چلا آتا۔ ابن رومی پر اس کا اس قدر اثر پڑتا کہ اُس روز وہم کے مارے دن بھر گھر سے باہر نہ نکلتا۔ جب تنگ آگیا تو اُس نے بھی اپنا حربہ سنبھالا اور اخفش کی ہجو کہنی شروع کر دی ع

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا

اخفش جو کلام فصیح پر شیدا تھا اپنی ہجو کے اشعار کو اُن کی خوبی اور روانی کی وجہ سے حفظ کر لیتا۔ اور مجالس اُملا میں جہاں اور اُستادوں کے شعر سند میں پیش کرتا وہاں اشعار بالا کو بھی موقع موقع سے سناتا جاتا اور فخریہ کہتا کہ چلو ابن رومی نے اس گمنام کو یاد تو کیا، اگرچہ ہجو کے ساتھ ہی سہی۔ بگڑے دل شاعر نے جو یہ قصہ سنا تو جل کر ہجو کہنی بھی چھوڑ دی[1]

حیف کہ یہ بہشتی زمانہ بہت دنوں تک مسلمانوں میں قایم رہ کر آخر آں جہانی ہو گیا۔ اور نزاعوں کے دروازے اُمت مرحومہ کے علما پر کھُل گئے۔ پھر کیا تھا۔ قدری و جبری تو ایک طرف رہے خود اہل سُنت و جماعت کے ناجی فرقوں میں وہ وہ جھگڑے ہوئے کہ کشت و خون تک نوبت پہنچی۔ بہت سے پیشوایانِ ملت نے خود سُنیوں کے ہاتوں سے ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں جن کو سُن کر دل کانپ اُٹھتا ہی۔ امام زاہد شیخ الاسلام انصاری نے جو حنبلی تھے حنفیہ اور شافعیہ علما کے ہاتوں کیا کیا مصیبتیں نہیں اُٹھائیں۔ پانچ مرتبہ ننگی تلوار اُن کی گردن پر رکھی گئی وطن چھوڑ کر بلخ جانا پڑا۔ سلطان الپ ارسلان جب ہرات پہنچا۔ تو مشائخ شہر ایک بہانے سے شیخ الاسلام کے خلوت خانے میں گئے اور اُن کے سجادے

---

[1] ابن۔ جلد ا۔ صفحہ ۳۳۲

کے نیچے ایک تانبے کی مورت رکھدی اور سلطان سے مخبری کی کہ ابو اسمٰعیل مجسمیہ فرقے کے پیرو ہیں اور انھوں نے اپنی محراب میں ایک بت رکھ چھوڑا ہے[1]۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ شیخ الاسلام وہ بزرگ عالی درجہ ہیں جن کی شان و عظمت کا اہل ظاہر و باطن دونوں نے اعتراف کیا ہے۔ حافظ کبیر ابو نعیم صاحب حلیہ جن کا نام آج تک ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے اُن کی ایک زمانہ میں یہ حالت تھی کہ مذہبی مخالفت کی وجہ سے لوگوں نے اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس زمانے میں حنبلیوں اور اشاعرہ میں اس قدر تعصب بھڑکا ہوا تھا کہ روز فتنہ و فساد برپا رہتا تھا۔ ایک دن جب حافظ ابو بکر ابن علی کی مجلس املا ختم ہو گئی تو ایک شخص نے کہیں یہ کہدیا کہ جس کو ابو نعیم کی مجلس درس میں چلنا ہو وہ اُٹھے۔ یہ کہنا تھا کہ اُس بیچارے کی شامت آ گئی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور سارے اصحاب حدیث قلم تراش لے لے کر اُس مصیبت زدہ پر دوڑ پڑے۔ قریب تھا کہ وہ اُسی موقع پر قتل ہو جائے۔ خدا خدا کر کے اُس کی جان بچی[2]۔ ہم انھیں دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سے زائد یہ قابلِ تاسف قصے بیان کرنا نہیں چاہتے حیف یہ ہے کہ جب کبھی جو کچھ کیا گیا ہمیشہ اُس کا نام نصرتِ دین اور حمایت ملت ہی رکھا گیا۔ اگر ہم اس باب کے اول و آخر واقعات کو ملائیں تو صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اتفاق و اختلاف کے لیے مذہب و عقائد کے ماوری بھی بہت سے اسباب ہیں۔ عنوان ہذا کو ہم ذیل کی نتیجہ خیز حکایت پر ختم کرتے ہیں۔

نحو کا امام یزیدی ایک دن امام ادب خلیل بصری سے ملنے گیا خلیل اُس وقت ایک وسادہ (گدّے) پر متمکن تھے۔ یزیدی کو آتا دیکھ کر ایک طرف کو ہو بیٹھے اور وسادے کا ایک حصہ خالی کر دیا۔ یزیدی نے بیٹھ کر کہا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ تکلیف سے بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر اُس ادیب بے نظیر نے یہ لاجواب جواب دیا ما ضاق موضع علی

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۰۶ و ۳۰۹ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۳ و ۲۹۴

اثنین متحابین والدنیا لا تسع اثنین متباغضین یعنی دو دوستوں کے لئے کوئی جگہ تنگ نہیں اور دو دشمنوں کے لئے سارے جہان میں بھی وسعت نہیں۔[1]

---

[1] ابن - ج ۴ صفحہ ۳۳۰

عنوان چہارم

حسن معاش

علمائے سلف کی طالب علمی۔ حق پسندی اور حالاتِ اتفاق و اختلاف سے ہم بحث کر چکے اور جیسی کچھ بحث کی گئی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ایک نہایت ضروری پہلو پر ہنوز بحث باقی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے علمانے دنیا میں کس طرح بسر کی اور اپنی معاش کو کس طور پر حاصل کیا اُن کے صفات کی تکمیل ایک حدتک اس موضوع پر منحصر ہے۔ دنیا اور اُس کے معاملات اگر لغو ہوتے تو پانچوں وقت کی نمازمیں دین کی بھلائی سے پہلے دنیا کی بھلائی کی دعا نہ مانگی جاتی اور فقہ کی کتابوں میں صرف عبادات کے ابواب ہوتے معاملات کے پیچیدہ مسائل کا ذکر نہ ہوتا۔ علما جب دنیا میں رہے اور دنیا کے تعلقات اُنھوں نے پیدا کیے۔ کسی انسان کے محکوم بنے کسی کے حاکم۔ مختلف مشرب و خیال کے آدمیوں سے مل جل کر اس عالم میں رہے تو فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ان تعلقات کو کیسا نباہا۔ آیا سلیقے اور خوبی سے سب کے حقوق ادا کیے یا اُن کو تسامح اور بے پروائی کے نذر کر کے اُس کا دل خوش کن نام استغنا رکھا۔ ائمۂ مجتہدین نے جو موشگافیاں مسائلِ معاملات میں کی ہیں اور جو آسان راہیں کاروبار کے متعلق نکالی ہیں وہ اس امر کی زبردست شہادت ہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کے معاملہ فہم اور معاملاتِ دنیا پر غور فرمانے والے تھے۔ اس عنوان میں سب سے اول ہم یہ دیکھینگے کہ علمائے سلف نے اپنی معاش کن ذرائع سے پیدا کی اُس کے بعد یہ بحث کرینگے کہ

اُن کے تعلقات ملوک و رعایا کے ساتھ کیسے رہے۔ آخر میں اُن کے مختلف حالات ایسے لکھینگے جن سے کسی نہ کسی پہلو سے اُن کی طرزِ معاشرت پر روشنی پڑیگی۔

کسب معاش

تجارت تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ سارے مسلمانوں میں افضل صحابۂ کرام تھے اور صحابہ میں مہاجرین کو فضیلت تھی اور مہاجرین میں قریش کا مرتبہ بڑھا ہوا تھا۔ قریش کا خاص پیشہ تجارت تھا جس کا ذکر کلام پاک میں جا بجا موجود ہے۔ علمائے سلف میں جن بزرگوں نے معاش قوت بازو سے حاصل کی اُن کا رجحانِ خاطر اکثر تجارت کی طرف رہا ہے چنانچہ ہم ذیل میں ایک جدول کے ذریعے سے اُن علما کے نام نامی مع اُس مال کے جس کی وہ تجارت فرماتے تھے عرض کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے بڑے علمائے اُمت نے تجارت کے وسیلے سے کسبِ معاش فرمایا تھا۔

نمبر	اسمائے علما	مال تجارت	کیفیت
۱	حضرت سالم ابن عبد اللہ	۰	بازار میں لین دین کیا کرتے تھے (تذ۔ جلد ا۔ صفحہ ۷۷)
۲	ابو صالح سمان	روغن زیتون و روغن زرد	(تذ۔ جلد ا۔ صفحہ ۸۰)
۳	امام یونس ابن عبید	ریشمی پارچہ	(تذ۔ جلد ا صفحہ ۱۳۰)
۴	داؤد ابن ابی ہند	"	(تذ جلد ا صفحہ ۱۳۱)
۵	امام ابو حنیفہ	"	امام ممدوح کی صدر دکان کوفے میں تھی اور اُن کے ایجنٹ جا بجا ملک میں پھیلے ہوئے تھے جو مال خرید کر صدر کو بھیجتے تھے۔ (تذ۔ جلد ا ص ۱۵۱)
۶	حضرت عبد اللہ ابنِ مبارک		امام ذہبی اُن کا ذکر یوں شروع کرتے ہیں الامام التاجر السفار دوسرے موقع پر فرماتے ہیں افنی عمرہ حاجًّا وتاجرًا۔ (تذ۔ جلد ا ص ۲۵۰)

نمبر	اسمائے علما	مال تجارت	کیفیت
۷	دیثمہ	پارچہ ریشمی	(ابن - جلد ۲ - صفحہ ۱۷۱)
۸	حافظ الحدیث غندر بصری	چادر اور سوتی پارچہ	(تذ - جلد ۱ - صفحہ ۲۷۵)
۹	عبدالرزاق حمیری	۰	امام ذہبی فرماتے ہیں رحل بتجارۃ الی الشام۔ تذ جلد ۱ صفحہ ۳۴۴
۱۰	امام القراء حمزہ زیات	زیتون و پنیر اور اخروٹ	کوفہ سے روغن زیتون حلوان کو لے جاتے وہاں سے پنیر اور اخروٹ لا کر کوفے میں بیچتے۔ (ابن - جلد ۱ - صفحہ ۱۶۷)
۱۱	حافظ الحدیث فضل کوفی	۰	(تذ - جلد ۱ - صفحہ ۳۴۱)
۱۲	حسن بن ربیع کوفی استاد امام بخاری	بورئیے	اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب بواری ہے (تذ - جلد ۲ ص ۴۴)
۱۳	امام ابو الحسن نیشاپوری	۰	(تذ - جلد ۳ - ص ۱۰۱)
۱۴	ہشام دستوائی	پارچہ	دستواء اہواز (عراق عرب) کا ایک پرگنہ تھا وہاں سے کپڑا لا کر فروخت فرماتے تھے اسی لئے دستوائی لقب پڑ گیا (تذ جلد ۱ ص ۱۴۱)
۱۵	احمد ابن خالد قرطبی	جبہ فروش	(تذ - جلد ۳ - صفحہ ۳۶)
۱۶	امام ابن جوزی	تانبا	ان کے گھرانے میں تانبے کی تجارت ہوتی تھی۔ آپ کبھی کبھی اپنے نام کے آگے صفار (ٹھٹیرا) لکھ دیتے (تذ - جلد ۴ ص ۱۳۷)
۱۷	حافظ الحدیث ابن رومیہ	ادویہ	اسی تجارت کے سبب سے ان کا لقب عشاب ہو گیا تھا علم نباتات میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ (تذ - جلد ۴ - ص ۲۱۷)
۱۸	ابو یعقوب لغوی	چوبی لٹھا	(ابن - ج ۱ ص ۳۱۵)
۱۹	محمد ابن سلیمان	گھوڑے	(تذ - ج ۳ ص ۱۰۸)

حرفت ۔ جن علمائے سلف نے اپنی معاش حرفت کے ذریعے حاصل کی اور ان کے نام

ہم کو معلوم ہو سکے اُن کے نام اور کام نیچے کے نقشے میں درج کیے جاتے ہیں۔

نمبر	اسمائے علما	نام حرفت	کیفیت
۱	ابو الفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور	نجاری	اس فن میں وہ بہت ماہر تھے اور کثرت سے کام اُن کے پاس آتا۔ بیمارستان کبیر شاہی شفاخانہ کے اکثر دروازے اُن کے ہاتھ کے بنے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں (ساعات) اُنھوں نے درست کی تھیں اور ان کی نگرانی کے متعلق اُن کو تنخواہ ملتی تھی۔ (تذ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۰)
۲	ابن طاہر	کتابت	صحیحین اور ابوداؤد سات بار اور سنن ابن ماجہ دس بار اُجرت پر لکھی (تذ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۰)
۳	امام ابوالولید باجی	تار دبجنا	(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۷۱)
۴	ابوسعید نحوی	کتابت	دس ورق روزانہ لکھتے تھے۔ یہ کام کر کے عدالت قضا میں اجلاس کرتے۔ انھیں اوراق کی اجرت پر بسراوقات تھی۔ (نزہۃ۔ صفحہ ۳۸۱)
۵	ابن الہیثم طبیب نامور	کتابت	تین کتابیں سال بھر میں لکھتے۔ مجسطی۔ متوسطات اور اقلیدس۔ ان کی قیمت ڈیڑھ سو اشرفی لیتے اور انھیں روپیوں پر بسر کرتے (عیون۔ جلد ۲۔ ص ۹۱)
۶	امام ابن ابی ضبعہ	کتابت	(تذ۔ ج ۴۔ ص ۴۲)

ملازمت ملازمت اس لحاظ سے کہ وہ انسانی آزادگی پر ایک ٹکس اور بھاری ٹکس لگانے والی ہی۔ اُن فراجوں کو راس نہیں جو سارے عالم کے بکھیڑوں سے ایک علم کی خاطر آزاد اور بے تعلق رہنا پسند کرتے ہیں اور اس وجہ سے ابتداءً ہم کو اس سے مایوسی بھی کہ ہم اس حصہ عنوان ہذا کو معمور کر سکینگے۔ مگر واقعات نے ہماری مایوسی کو بدگمانی ثابت کیا اور حالات سے تبلایا کہ علمائے سلف نے علمی شان کو قائم رکھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دنیاوی عہدے حاصل کئے اور اُن کے فرائض قابلِ ستائش طریقے سے انجام دیئے ہیں۔ ہم ذیل میں چند اُن علماء کے اسم گرامی درج کرتے ہیں جو عہدۂ جلیلہ وزارت تک ترقی کرکے پہنچے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہی کہ اس سے کم درجے کے عہدے بھی اُن کی ذات سے ممتاز رہے ہونگے۔

نمبر	اسمائے علما	کس بادشاہ کے وزیر رہے	کیفیت
۱	امام ابوالفضل ابن خرابہ بغدادی	ملک کافور والی مصر	امام دارقطنی نے اُن سے روایت کی ہی اور حافظ شارح اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان من الحفاظ الثقاة ویروی فی حالة الوزارة (تذ۔ ج ۳۔ ص ۲۲۶ و ۲۲۷)
۲	قاضی علامہ ابن نظیر	۔	(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۶۳)
۳	امام ابن حزم	خلیفہ مستظہر باللہ	(تذ جلد ۳۔ صفحہ ۳۲۴)
۴	امام لغت و نحو قلیلی	مکتفی باللہ خلیفہ اندلس	(ابن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۲)
۵	کمال الدین فقیہ شافعی	نورالدین زنگی والی شام و مصر	قاضی ابن خلکان اُن کی نسبت کہتے ہیں کان عظیم الریاسته خبیراً بتدبیر الملک (ابن ج ۱۔ ص ۴۷۲)
۶	مولانا تاج الدین ابراہیم پاشا رئیس الوزراء	سلطان بایزید یلدرم	(شق۔ ج ۱۔ ص ۲۳۱)

تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں مگر نمونے کے لیے اسی قدر شاید کافی ہونگی۔ کم درجے کی ملازمتیں اختیار کرنے سے بھی علما کو احتراز نہیں رہا ہے۔ چنانچہ لکھا ہی کہ قبیصہ خلیفہ عبدالملک کے مہر دار تھے[51]۔ امام اسمٰعیل جو امام اوزاعی کے اُستاد ہیں خلیفہ منصور کے توشہ خانے (خزانۃ الثیاب) کے داروغہ[52]۔ اسی سلسلے میں ہم کچھ نظیریں اُن علما کی پیش کرنا چاہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ایک دربار کی جانب سے دوسرے دربار کو بطور سفیر تشریف لے گئے۔ سب سے زیادہ قابل غور امام شعبی اور شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کی مثالیں ہیں۔ اول الذکر میں یہ امر لائق لحاظ ہی کہ جس دربار کو سفارت لے گئے وہ غیر مسلم دربار تھا۔ اور دوسرے میں وہ تفرد و تجرید قابل لحاظ ہے جو سرگروہ سلسلۂ سہروردیہ کو دنیاوی تعلقات اور علائق سے تھی۔ یہ مثالیں بین ثبوت اس امر کا ہیں کہ علمائے کرام کو ہر حال میں مسلمانوں کے مصالح دینی کے ساتھ دنیاوی مصلحتوں پر نظر رہی ہی اور دونوں کو اُنھوں نے قابل توجہ خیال فرمایا ہے۔

نمبر	اسمائے علما	کس دربار کی جانب سے سفیر ہوئے	کس دربار میں گئے	کیفیت
١	امام شعبی	خلیفہ الملک اموی	قیصر روم	قیصر کے دل پر اُن کی دانشمندی کا بہت اثر ہوا۔ اور اُس نے خلیفہ کو لکھا کہ مجھے تعجب ہے کہ ایسے شخص کے ہوتے مسلمانوں نے کیوں دوسرے شخص کو خلیفہ بنایا جب واپس آنے پر خلیفہ نے یہ فقرہ امام شعبی کو سنایا تو آپ نے کہا اور کیا خوب کہا کہ قیصر نے مجھکو تو دیکھا مگر آپ کو نہیں دیکھا آپ کو دیکھ لیتا تو ایسا نہ لکھتا۔ (تذ۔ ج ١۔ ص ٧٤)
٢	شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی	دیوان عزیز یعنی دربار بغداد	دربار اربیل	(ابن۔ ج ١۔ ص ١٥٤)

[51] تذ۔ ج ١۔ ص ٥٢ [52] تذ۔ ج ١۔ ص ٢٣٠

نمبر	اسمائے علما	کس دربار کی جانب سے سفیر ہوئے	کس دربار میں گئے	کیفیت
۳	حافظ ابن ماکولا	دیوان عزیز	طغا خان والی سمرقند	(تذ-جلد ۴-ص ۵)
۴	امام ابوالمحاسن قرشی	"	نورالدین زنگی	اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی (تذ-ج ۴-ص ۱۵۸)
۵	امام ابو یعقوب شیرازی	"	متعدد دربار	(تذ-جلد ۴-ص ۱۵۰)
۶	محمد ابن سلامہ قضاعی	دربارِ مصر	دربار روم	حمیدی نے اُن سے روایت کی ہے (ابن ج ۱-ص ۴۶۲)
۷	کمال الدین فقیہ یمنی	خلیفہ مقتفی باللہ	قلیج ارسلان والی روم	(ابن جلد ۱-ص ۲۴)
۸	علامہ قوشجی شارح تجرید	مرزا الغ بیگ والی سمرقند	سلطان محمد خاں فاتح	ان دونوں سلطنتوں میں نزاع تھا اسی لئے یہ بھیجے گئے تھے اُن کی حسن سعی سے صلح ہو گئی (شق-ج ۱-ص ۱۷۷)

تموّل اہل کمال کے لئے مالدار ہونا اُن کی خوبی میں داخل نہیں اور نہ اس کے عدم یا وجود سے اُن کی عظمت کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ بااین ہمہ متموّل ہونا اور باکمال ہونا یہ دونوں صفتیں باہم منافی بھی نہیں حالات خاص نے اس کا مخالف پہلو ذہنوں میں راسخ کر دیا ہے۔ اور اس پہلو کے ذہن نشین ہونے سے بجائے نفع کے قوم کو نقصان پہنچا ہے۔ ہم اس غلطی کو رفع کرنے کے لئے مختصر سے واقعات ایسے عرض کرنے کے درپے ہیں جو علمائے دین اور ائمہ مذہب کے تموّل کا ثبوت دیں ان میں سے بعض واقعات یہ بھی دکھلائینگے کہ جو دولت سرمایۂ غفلت تصور کی گئی ہے وہی نیک اور لائق ہاتھوں میں پہنچ کر کیسی خیر و برکت کا باعث ہو سکتی ہے۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسّی ہزار اشرفیاں تھیں (آٹھ لاکھ روپئے) مگر کبھی اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی (اس لئے کہ سال گزرنے سے پہلے کل آمدنی نیک کاموں میں صرف کر دیتے تھے[1]۔ امام دعلج بغدادی جو دارقطنی کے اُستاد ہیں اُن کی سرکار سے مکہ مکرمہ

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ صفحہ ۶

عراق اور سجستان کے علمائے حدیث کے وظائف مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ میں ایک مکان جس کا نام دار العباس تھا اُنھوں نے تیس ہزار اشرفی کو خریدا تھا۔ جب اُنھوں نے وفات پائی۔ تو معز الدولہ نے تین لاکھ اشرفیاں اُن کے ترکے میں سے لے لیں[۱]۔ امام ابو ہیثم کی نسبت لکھا ہی کہ بہت مالدار تھے۔ تین یا چار دفعہ اُنھوں نے اپنے ہم وزن چاندی خیرات کی تھی[۲]۔ حافظ ابن العربی کے تموّل اور فیاضی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہی کہ اشبیلیہ (واقع اندلس) کی شہر پناہ اُنھوں نے اپنی جیب خاص سے تعمیر کرائی تھی[۳]۔ حافظ رئیس ابن ابی ذویل ہروی کی سالانہ آمدنی اتنی تھی کہ عشر کی بابت ایک ہزار خروار غلے کی سال بسال اُن کی سرکار میں آتی تھیں۔ امام ذہبی اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان کثیر الاموال[۴]۔ قاضی عیاض صاحب مشارق الانوار کو اپنے عہد میں اس قدر رفعت اور ریاست حاصل تھی کہ کبھی کسی کو اُن کے شہر میں نصیب نہیں ہوئی۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ جس قدر اُن کی رفعت بڑھی اُسی قدر اُن کی تواضع اور خوف الٰہی میں ترقی ہوتی گئی[۵]۔ شیخ ابو حامد اسفرائنی کی نسبت ابن خلکان اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ انتهت اليه رياسة الدنيا والدين ببغداد[۶]

علما کے تعلقات سلاطین کے ساتھ اور اُن کا اثر سلاطین پر

انقلاب زمانہ نے جو تہ بتہ پردے علمائے سلف کے حالات پر ڈالے ہیں اُنھوں نے اُن کی بہت سی اعلیٰ اور مفید صفتیں نظروں سے چھپا دی ہیں۔ جب اُن کے صفات کی اصلی تصویریں چھپ گئیں تو ذہنوں میں اُن کے غلط نقشے کھنچے اور جیسے وہ نہ تھے ویسے مانے گئے اور جب ان غلط نقشوں کی پیروی کی گئی تو قدم راہِ صواب سے دُور

---

[۱] تذ ج ۳ - صفحہ ۹۸ [۲] تذ - ج ۱ - صفحہ ۲۳۶ [۳] تذ - ج ۴ صفحہ ۹۱ [۴] تذ - ج ۳ - صفحہ ۲۱۳
[۵] تذ - ج ۴ - صفحہ ۱۰۰ [۶] ابن - ج ۱ - صفحہ ۱۹

جا پڑے اور مقصود فوت ہو گیا۔ علمائے کرام کی نسبت گویا یہ مسلّمہ مسئلہ ہی کہ اُن کو سلطنت و سلاطین سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ تعلق اُن کے لئے زیبا ہی۔ اسی خیال کا یہ اثر ہی کہ ہم صدیوں سے علما اور سلاطین کو باہم محض ناآشنا اور بیگانہ پاتے ہیں۔ جن دقیق نگاہوں نے سوسیٹی کے حالات اور اُس کے باہمی تعلقات کی پوری پوری چھان بین کی ہی اُنھوں نے پتا لگایا ہی کہ مختلف تمدنی گروہ کسی نہ کسی قانونی سلسلے میں ضرور جکڑے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی متناسب جگہ پر کسی نہ کسی اصول کے مطابق قائم ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہی کہ اگر ان سلسلوں میں سے کوئی سلسلہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو نظامِ قومی درہم برہم ہو جائے گا۔ کوئی شبہ نہیں کہ جب علما کا قدم سلسلۂ انتظام سے نکل گیا تو جو کام اس عظیم الشان سلسلے میں اُن کے کرنے کے تھے وہ ابتر ہو گئے اور اس طرح حکومت و خلافت کی وہ ہیئت کذائی قائم نہ رہی جو اسلام نے کھینچی تھی۔ ہم نے جس تعلق کی نفی اوپر کی ہی اُس سے ہماری مراد وظیفہ خواری یا صلہ بخشی کا تعلق نہیں ہی بلکہ وہ تعلق مراد ہی جو ایک رکن انتظام کو اُس کے سر گروہ کے ساتھ ہوتا ہی۔ ہماری اس تمہید کو جو حضرات ملاحظہ فرمائیں وہ علما کا مفہوم ذرا عالی ذہن میں قرار دیں ورنہ ہمارے الفاظ بھٹی سے زیادہ رتبہ حاصل نہ کرینگے۔ یہ امر ظاہر ہی کہ ہر منصب اور ہر مرتبہ خاص خاص صفات چاہتا ہی اور جب تک انسان وہ صفات نہ پیدا کرے اُس منصب کے لائق نہیں ہو سکتا جن علما کے سلسلۂ انتظام سے خارج ہو جانے کی وجہ سے ہم نے سلسلۂ حکومت کو ابتر قرار دیا ہی وہ علما وہ تھے جو مدبرانہ دل و دماغ رکھتے تھے اور معاملے کو معاملے کے پہلو سے سمجھنے والے تھے نہ کسی اور پہلو سے۔ ہم جو واقعات اس سلسلے میں پیش کرینگے وہ شاید اس بات کے ثابت کرنے میں قاصر نہ رہیں کہ علما نے جو سلطنتوں اور سلاطین سے تعلق رکھا تو وہ تعلق عامۂ مسلمین اور خود سلطنت کے حق میں کیسا مفید ہوا۔ اور کیسی دینی اور

دنیاوی برکتیں اُن سے مسلمانوں کو پہنچیں جو تعلق ایسا فائدہ مند اور نافع تھا وہ حقارت اور نفرت سے دیکھے جانے کے لائق نہ تھا۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ بہت سے علمائے کرام وقتاً فوقتاً یا ہمیشہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ایسے تعلقات کو عار بلکہ مضر تصور فرمایا ہی مگر ساتھ ہی اُس کے ہجری صدیوں کے اوائل میں کچھ نہ کچھ علمائے کرام ہمیشہ ایسے بھی موجود ہوتے تھے جو ان تعلقات کو اختیار فرماتے تھے اور اس طرح دینی و دنیاوی سلسلوں میں سدِّ سکندری قائم نہیں ہونے پاتی تھی۔ امام اعظم نے عہدۂ قضا قبول نہیں فرمایا اور اس سختی سے انکار فرماتے رہے کہ دُرّے کھائے قید بھگتی اُنھیں کے شاگردِ رشید امام ابو یوسف سارے قاضیوں کے سرگروہ بنے اور ہارون الرشید کی مشہور خلافت کی خوبیوں میں ایک خوبی اُن کی ذات سے پیدا ہوئی ع

وللناس فیما یعشقون مذاھب

حضرت عمر ابن عبدالعزیز جن کی خلافت خلافتِ راشدہ مانی گئی ہی اور جن کے عہدِ حکومت نے عالم کو عدل و انصاف سے مالا مال کردیا تھا۔ اگر ایک امام تابعی کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو بظاہر اسباب دُنیا اُن کی حکومت کی نعمت سے محروم رہتی اور از سرِ نو عالم میں اسلامی تازہ روح نہ پھکتی۔ جب سلیمان ابن عبدالملک خلیفہ دمشق کو شدتِ مرض نے مایوسی کے انداز دکھلائے اور رحلت کے قرب کی پیشین گوئی کی تو اُس کو اپنے جانشین کے تعین کی فکر ہوئی ایک کاغذ پر اُس نے ولی عہد کا نام لکھا اور مشورے کے لئے امام رجاء[۱] ابن حیات کے سامنے پیش کیا۔ امام ممدوح نے جو اُس کو پڑھا تو اُس میں خلیفہ کے ایک نابالغ بیٹے کا

[۱] تابعین کے چوتھے طبقے میں فن حدیث کے امام ہیں۔ مکحول نے اُن کو سید اہل شام بتایا ہی اور بعض نے شامیوں میں سب سے زیادہ فقیہ اُن کو مانا ہی۔ (تذ۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵)

نام درج پایا۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے سلیمان سے فرمایا کہ خلیفہ کو اگر قبر میں آسودگی مطلوب ہے تو اپنا جانشین مرد لائق مقرر کرنا چاہیئے۔ خلیفہ کے دل میں اُن کا یہ کلام چُبھا اور اُس نے کہا کہ میں مکرر غور کر لوں۔ ایک یا دو دن کے توقف کے بعد اُس نے وہ کاغذ چاک کر ڈالا۔ اور امام ابن حیات کو بُلا کر پوچھا کہ میرے بیٹے داؤد کی نسبت تمھاری کیا رائے ہے۔ امام نے فرمایا کہ وہ قسطنطنیہ کی مہم پر یہاں سے صدہا میل دُور ہے اور نہ معلوم اس وقت زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خلیفہ۔ تو پھر میں کس کو ولی عہد مقرر کر لوں۔ امام۔ جو امیر المومنین کی رائے میں اس منصب کے قابل ہو۔ خلیفہ۔ عمر ابن عبد العزیز کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے۔ امام۔ میرے خیال میں وہ نیک۔ فاضل اور سلیم الطبع ہیں۔ خلیفہ۔ تمھاری رائے درست ہے۔ وہ ایسے ہی ہیں اور میں اُنھیں کو ولی عہد کرونگا۔ یہ کہکر سند ولی عہدی حضرت عمر ابن عبد العزیز کے لئے لکھی اور اُس کو سر بمہر کر دیا۔ اس کے بعد کوتوال شہر کو طلب کر کے حکم دیا کہ خاندان خلافت کے کل ارکان حاضر کئے جائیں۔ جب سب حاضر ہو لئے تو امام رجا ؒ نے حسب ایمائے خلیفہ اُس سر بمہر کاغذ پر سب سے بیعت لی اور بعد بیعت اُن کو رخصت کر دیا۔ اس عہد نامہ کی تکمیل کے بعد اجل نے سلیمان کو زیادہ مہلت نہیں دی اور چند ہی ساعت کے بعد اُس کو ملک و مال سے جدا کر دیا۔ امام ابن حیات نے ایک معتمد ایوان خلافت کے دروازے پر بٹھا دیا کہ کسی کو اندر نہ جانے دے اور اس طرح وفات کی خبر کو شائع ہونے سے روک دیا۔ اس انتظام سے فارغ ہو کر اُنھوں نے کوتوال کے ذریعے سے پھر اہل بیت خلافت کو بُلایا اور دوبارہ اُس سر بمہر فرمان پر بیعت لی۔ جب بیعت ہو چکی اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اب کل کارروائی مستحکم ہے تو فرمایا کہ خلیفہ نے وفات پائی اور یہ کہکر کاغذ کھول کر سنا یا۔ جب ہشام ابن عبد الملک نے (جو دعویدار خلافت تھا) حضرت عمر ابن

عبد العزیز کا نام سُنا تو کہنے لگا۔ کہ قسم ہے رب کی ہم کبھی ان کی بیعت نہیں کر سکتے۔ امام رجاء نے کہا کہ بہتر ہے کہ کھڑے ہو اور آکر بیعت کرو ورنہ تلوار سے تمھارا ہی فیصلہ ہو جائیگا۔ ہشام کو موقعے کا رنگ دیکھ کر چار و ناچار بیعت کرنی پڑی۔ ہشام کی بیعت کے بعد امام رجاء نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کا بازو پکڑا اور منبر پر بٹھا دیا۔ منبر پر پہنچتے ہی اُن کی خلافت کا عملی دور شروع ہو گیا۔ اس واقعے سے امام رجاء ابن حیات کی قوت فیصلہ۔ حسن تدبیر اور استقلالِ طبیعت جیسا کچھ ظاہر ہوتا ہے الفاظ خود بتا رہے ہیں۔ ہمارے جتانے کی کچھ حاجت نہیں[1]۔ امام ابو یوسف کا جو اقتدار خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں رہا اُس سے ایک عالم واقف ہے۔ ابن خلکان اُن کی نسبت لکھتے ہیں کہ ابو یوسف علم و حکمت اور ریاست و اقتدار میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ اُن کے زمانے میں اُن سے بڑھکر کوئی دربار میں نہ تھا[2]۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مذہب حنفی کی اشاعت میں امام ابو یوسف کے اقتدار نے غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی۔ امام یحییٰ ابن یحییٰ مصمودی جو حضرت امام مالک کے شاگرد رشید اور موطا کے ناقل ہیں ملک اندلس کے امرا و سلاطین کے یہاں بہت محترم تھے اسی اقتدار کے اثر سے امام مالک کا مذہب ملک اندلس میں پھیلا[3]۔ ایک اور امام وقت حضرت یحییٰ ابن اکثم دربار مامونی میں اول درجے کے ذی اثر رکن تھے۔ ابن خلکان اُن کی نسبت یہ الفاظ لکھتے ہیں اُن کے علم و فضل۔ ریاست اور سیاست اور اُس تعلق سے جو اُن کو خلفا اور سلاطین کے ساتھ رہا زمانہ واقف ہے۔ مامون الرشید کے مزاج پر وہ اس قدر حاوی تھے کہ کسی کی وقعت اُن سے زیادہ خلیفہ کے دل میں نہ تھی۔ چونکہ خلیفہ کو علوم میں کمال تھا اس لئے اُس نے اُن کے علم و عقل کے مرتبے کو کماحقہٗ سمجھا تھا۔ عہدۂ قاضی القضاتی پر وہ ممتاز تھے۔ تدبیر مملکت

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۱۵ و ۱۶ [2] ابن - ج ۲ صفحہ ۳۰۴ [3] ابن - ج ۲ صفحہ ۲۱۶

میں اُن کو اس قدر مداخلت حاصل تھی کہ وزرا کے احکام اُن کی رائے لینے کے بعد نافذ ہوتے تھے۔[1] سلطان شہاب الدین غوری کی (جس کا نام تاریخ ہندوستان میں آج تک روشن ہے) مدد آغازِ کار میں امام فخرالدین رازی نے اپنے مال و دولت سے فرمائی تھی۔ جب وہ بڑھ کر سلطان ہو گیا تو یہ اُس کے دربار میں گئے اور شہاب الدین نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اسی طرح امام ممدوح دربار خوارزم میں موقر اور محترم تھے۔[2] امام زہری خلیفہ عبدالملک اور ہشام کے متقربین میں تھے۔[3] اور خطیب بغدادی عزالدولہ کے مقربوں میں داخل تھے۔[4] مولانا قونوی کی نسبت لکھا ہے کہ سلطان روم کے حضور میں اُن کو نہایت ہی قدر تمکین حاصل تھی اور زور بس تک وہ اسی شان سے مقبول بارگاہ سلطانی رہے۔[5] امام غزالی نے جب امیر المسلمین یوسف ابن تاشفین کی تعریف سُنی تو اُس سے ملنے کے لئے افریقہ کو روانہ ہوئے۔ امام ممدوح ہنوز منزل مقصود تک نہ پہنچے تھے کہ امیر موصوف کو اجل نے عالم آخرت میں پہنچا دیا۔ یہ خبر امام غزالی نے اسکندریہ میں سُنی اور وہیں سے واپس چلے آئے۔[6]

ابن رافع قشیری حافظ حدیث اپنے مکان پر حدیث شریف پڑھایا کرتے تھے اور طلبہ کے علاوہ خراسان کے امرا نامور طاہر کی اولاد بھی مع خدم و حشم حاضر درس ہوتی۔ شیخ کے جلال کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی کو بات کرنے یا مسکرانے کی تاب و مجال نہ ہوتی۔[7] ملک عادل سلطان صلاح الدین کا بھائی بڑے دبدبے اور سطوت کا فرمانروا گزرا ہے۔ ایک مرتبہ محدث اسلام عبدالغنی دمشقی اُس سے ملنے گئے تھے۔ ملک عادل کا بیان ہے کہ جس وقت حافظ عبدالغنی میرے سامنے آئے تو مجھکو یہ معلوم ہوا کہ ایک شیر آگیا۔[8] امیر تیمور نے

---

[1] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۷ [2] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۵۰۴ [3] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۵۱۴ [4] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۳۴

[5] العقد المنظوم صفحہ ۳۶۹ [6] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۷۰ [7] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۹۳ [8] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۹

ایک دفعہ اپنا ایک قاصد کسی ضروری کام پر روانہ کیا اور اُس کو عام اجازت دی کہ ضرورت کے وقت جس کا گھوڑا مل جائے اُس پر سوار ہو لے۔ قاصد کو چلتے چلتے ایک جگہ سواری کی حاجت ہوئی۔ اتفاقاً اسی موقع پر علاّمہ تفتازانی مصنف مطول خیمہ زن تھے اور خیمے کی پیشگاہ میں اُن کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے برید وہاں گیا اور جاتے ہی بے دھڑک ایک گھوڑا کھول لیا۔ علامہ ممدوح اُس وقت اپنے خیمے کے اندر تھے۔ اِس قصے کی اطلاع ہوئی تو نہایت برہم ہوئے اور قاصد سلطانی کو پٹواکر نکلوا دیا۔ وہ جب لوٹ کر دربار میں پہنچا تو علامہ کی شکایت پیش کی امیر تیمور کا جو حال یہ ماجرا سُن کر ہوا ہوگا آسانی سے قیاس میں آسکتا ہے؟ ہیجانِ غضب کے سبب سے تھوڑی دیر ساکت رہا اُس کے بعد کہا کہ اگر شاہرخ یہ حرکت کرتا تو بے شک سزا پاتا۔ مگر میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کرسکتا جس کا قلم ہر شہر و دیار کو میری تلوار سے پیشتر فتح کرچکا تھا[۱] عمرو صفار والی خراسان امام خفاف سے کہا کرتا تھا کہ جہاں اگر میں کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کروں تو آپ میری گردن اُڑا دیں[۲]۔ سلاطین عثمانیہ میں سلطان سلیم خاں بڑے جلال اور ہیبت کا بادشاہ ہوا ہے۔ ایک دفعہ اُس کو ملازمانِ خزانہ پر غصہ آگیا اور اُن میں سے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ مولانا علاء الدین جمالی ان دنوں قسطنطنیہ میں مفتی تھے اُنھوں نے جو یہ سخت حکم سُنا تو اُن بے کس ملازموں پر رحم آیا اور سلطان کو سمجھانے کے لئے بابِ عالی کو تشریف لے گئے۔ قاعدہ یہ تھا کہ مفتی صدر بدون کسی حادثۂ اعظم کے بابِ عالی کا قصد نہیں کرتا تھا۔ جب یہ ایوانِ وزراء میں داخل ہوئے تو سارے اہل دیوان حیران رہ گئے کہ خدا خیر کرے مفتی صاحب کیسے تشریف لائے۔ حضور سلطانی میں ان کی اطلاع ہوئی اور یہ اجازت ملی کہ تنہا آئیں۔ یہ وہاں پہنچے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد سلسلہ تقریر یوں

---

[۱] شق۔ ج ۱۔ ص ۹۵ [۲] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۲۸

شروع کیا۔ جو علما منصب فتویٰ رکھتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ سلطانِ وقت کی آخرت درست رکھنے کی فکر رکھیں۔ میں نے سنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے حالانکہ شرعاً یہ تجویز ناجائز ہے لہٰذا میں عفو سلطانی کی استدعا کرتا ہوں۔ سلطان کو اپنے مفتی کی یہ مداخلت نہایت شاق اور ناگوار معلوم ہوئی اور قہر آلود ہو کر کہا کہ تم کو اپنی حد اختیار سے بڑھنا اور امور سلطنت میں دخل دینا نہیں چاہیے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں معاملات سلطنت میں دخل نہیں دیتا بلکہ عاقبت سلطانی کی عافیت چاہتا ہوں اور میرا یہ فرض ہے ان عفوت [1] فلک النجاۃ والا فلک عقاب عظیم سلطان کے دل پر اس کلام کی جلالت اثر کر گئی اور غصہ فرو ہو گیا۔ اور اُن تمام ملازموں کی خطائیں معاف کر دیں۔ جب مفتی ممدوح نے اُٹھنے کا قصد کیا تو فرمایا کہ میں سلطان کی آخرت کے متعلق تو فرض منصبی ادا کر چکا اب ایک بات شانِ سلطنت کی نسبت کہنا چاہتا ہوں۔ سلطان نے پوچھا وہ کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ سب بیچارے آپ کے غلام ہیں کیا یہ مناسب ہوگا کہ غلام شاہی ہو کر دربدر مانگتے پھریں۔ سلطان نے فرمایا کہ نہیں۔ اُنھوں نے کہا تو اُن کی جگہ پھر اُنھیں کو عطا فرمائی جائے۔ سلطان نے ازراہ مراحم خسروانہ اس کو بھی قبول کیا مگر یہ کہا کہ اُن کو قصور کی سزا ضرور دی جائیگی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس میں مجھ کو کچھ کلام نہیں ہے کیونکہ تعزیری سزا رائے سلطانی پر منحصر ہے۔ اتنا کہہ کر سلام کیا اور گھر کو چلے آئے۔ [2]

ملک پر اثر

اس بیان میں شاید کسی تمہید کی حاجت نہیں ہے۔ علما کی جو عظمت ہمیشہ مسلمانوں کے دل میں رہی ہے اس کے کچھ نہ کچھ آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ علمائے سلف کو جو مقبولیت عامۂ خلق میں حاصل رہی ہے اور عموماً اہل ملک نے جس محبت

---

[1] اگر تم معاف کر دوگے تو نجات پاؤگے ورنہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگے [2] شق - ج ۱ صفحہ ۳۲۳

اور ادب کی نظر سے اُن کو دیکھا ہے اُس کی کیفیت پڑھکر ایک قسم کا تحیر پیدا ہوتا ہے۔ اگر صرف اُن کے ہم مسلک اور ہم مذہب اُن کی توقیر کرتے اور ان پر قربان ہوتے تو ہم یہ سمجھتے کہ مذہبی خیالات کا کرشمہ تھا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مخالف فرقے اور یہود و نصارا اُن کی تعظیم و محبت میں ایسے ہی سرگرم اور محو تھے جیسے خود اُن کے ہم مشرب تو ہم کو یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ محض مذہبی خیالات نہیں بلکہ علما کے اخلاق و صفات اُن کی عظمت کے اہم اور اصلی اسباب تھے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس مقبولیت کو اُس فیاضی خیال اور وسعت نظر سے بہت ترقی ہوتی تھی جو عموماً ہم علمائے سلف میں پاتے ہیں اور یہ اُن کی فیاضی کسی طبقے اور فرقے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ عموماً بندگانِ خدا کے واسطے عام اور شامل تھی۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مع لشکر شہر رقہ میں خیمہ زن تھا۔ اتفاقاً اسی موقع پر حضرت عبداللہ ابن مبارک امام حدیث کا گزر شہر مذکور میں ہوا۔ اُن کے استقبال کے لیے لوگوں کا یہ ہجوم ہوا کہ سارے افق پر غبار چھا گیا اور کش مکش میں آدمیوں کی جوتیاں پارہ پارہ ہوگئیں۔ حرم سرائے خلافت کے چوبی برج سے خلیفہ کی ایک کنیز نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو حیرت زدہ ہوکر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کسی نے کہا کہ خراسان کے عالم ابن مبارک تشریف لائے ہیں۔ اُن کے لینے کے لیے مخلوق کا ہجوم ہو رہا ہے۔ شوخ مزاج کنیز نے بے ساختہ کہا کہ واللہ حکومت اس کو کہتے ہیں۔ ہارون کی کیا حکومت ہے جس کے لیے لوگ اہلکاروں کے زور اور دباؤ سے جمع ہوتے ہیں[1]۔ امام بخاری جب دربار علم سے کمال کا خلعت پہن کر اپنے وطن بخارا کو آئے تو بخاریوں نے نہایت جوش کے ساتھ اُن کے استقبال کا اہتمام کیا۔ شہر سے تین میل کے فاصلے پر خیمے ایستادہ کئے گئے اور تمام اہل بخارا اُن کی پیشوائی کے واسطے آئے یہاں تک کہ

---

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۴۹

کوئی قابل ذکر آدمی باقی نہیں رہا۔ شہر میں اُن کو اس شان سے لائے کہ روپے اور اشرفیاں سر پر سے نثار کی جاتی تھیں۔ ہمارے علوم کا دوسرا مرکز شہر نیشاپور بھی امام ممدوح کی تعظیم میں اپنے ہمسر بخارا سے پیچھے نہیں رہا۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ جب امام بخاری کے تشریف لانے کی خبر نیشاپوریوں نے سُنی تو بعض نے دو منزل اور بعض نے تین منزل آگے چل کر استقبال کیا اور شہر میں جس شان سے وہ داخل ہوئے وہ شان میں نے کسی حاکم یا عالم کی آمد میں نہیں دیکھی۔[1] امام فروزی جب ایک دینی کام کے لئے شہر بغداد سے چلے تو ایک جم غفیر نے اُن کی مشایعت کا قصد کیا۔ اُنھوں نے ہر چند منع کیا لیکن جوش عقیدت میں کسی نے ممانعت کا لحاظ نہیں کیا۔ سامرہ[2] پہنچ کر ہجوم کا اندازہ کیا گیا تو پچاس ہزار آدمی تخمینے میں آئے[3]

ایک مرتبہ شیخ ابو اسحٰق شیرازی خلیفۂ بغداد کی طرف سے ایک خدمت پر خراسان تشریف لے گئے تھے۔ جب وہ نیشاپور سے معاودت کرنے لگے تو پیشوائے خراسان امام الحرمین نے سوار ہوتے وقت رکاب تھام لی۔ اس کا اثر تمام ملک خراسان میں یہ ہوا کہ شیخ ممدوح کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی مٹی بطور تبرک اُٹھائی اور آنکھوں سے لگائی گئی۔[4] سفیان ابن عُیینہ جب کوفے میں تشریف لائے اور امام اعظم نے اُن کے آنے کی خبر سُنی تو شاگردوں سے فرمایا کہ تمھارے شہر میں عمرو ابن دینار کے علم کا حافظ آیا ہے۔ اس مختصر جملے نے سارے اہل کوفہ کے دل ابن عیینہ کی جانب مائل کر دیئے اور لوگ جوق جوق ابن دینار کی احادیث سننے کے لئے اُن کی خدمت میں آنے لگے۔ اُس وقت ابن عیینہ کی عمر بیس برس سے کم تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مجھ کو اوّل محدث بنایا وہ ابو حنیفہ ہیں۔[5] علما کے ساتھ عامۂ خلائق کا یہ جوش عقیدت صرف اُن کی زندگی تک محدود نہ تھا اُن کے وفات فرما جانے

---

[1] مقدمہ صفحہ ۱۸۵ و ۲۰۵ ۔ [2] شہر بغداد کا ایک حصہ ۔ [3] تذ ۔ ج ۲ ۔ صفحہ ۲۰۰ ۔ [4] ابن ۔ ج ۲ ۔ صفحہ ۱۲۴ ۔
[5] ابن ۔ ج ۱ ۔ صفحہ ۲۱۱

کے بعد بھی قائم رہتا تھا۔ بلکہ بعد وفات اور زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ امام طاؤس تابعی کا جنازہ جب اٹھایا گیا تو آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ جنازہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ آخر حاکم وقت نے فوج بھیجی اور اس کے اہتمام سے جنازہ نکلا۔ خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ حضرت عبداللہ ابن حسن (رضی اللہ عنہما) جنازے کو اٹھائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی کشمکش سے ان کا لباس پارہ پارہ ہوگیا[1]۔ امام الحرمین نے جب وفات پائی تو تمام شہر نیشاپور کے بازار ماتم میں بند ہوگئے اور جامع مسجد میں جس منبر پر امام ممدوح خطبہ پڑھا کرتے تھے وہ توڑ دیا گیا[2]۔ اسی طرح جب امام ابویعلیٰ موصلی کا انتقال ہوا تو اکثر بازار شہر کے بند کر دیئے گئے[3]۔ امام ابوجعفر طبری کی قبر پر کئی مہینے تک شب و روز نماز جنازہ پڑھی گئی[4]۔ امام ابی داؤد کے جنازے کی نماز اسی دفعہ ادا ہوئی کل نمازیوں کا تخمینہ کیا گیا تو تین لاکھ ہوا[5]۔

مخالف فرقوں کی محبت ہمارے علما کے ساتھ

امام ابو العلاء ہمدانی سے خوارزم کے لوگ جو عموماً معتزلی تھے نہایت محبت رکھتے تھے حالانکہ امام ممدوح کو اپنے مذہب حنبلی میں نہایت شدت تھی[6]۔ بغداد کے اہل سنت و جماعت اور شیعہ میں ایک بار تنازع ہوا تو فریقین نے امام جوزی کو فیصلے کے لئے حَکم قرار دیا۔ ایک زمانے میں دمشق کا حاکم جو شیعی تھا خطیب بغدادی سے برہم ہوگیا تھا۔ اس نے کوتوال شہر کو یہ ایما کر دیا کہ خطیب کسی حیلے سے قتل کر دیئے جائیں۔ امام ممدوح کو جب اس سازش کی خبر ہوئی تو انھوں نے شریف ابوالحسن کے مکان میں پناہ لی۔ جب کوتوال نے ان سے خطیب کو طلب کیا تو شریف موصوف نے فرمایا کہ خطیب کا قتل بالکل خلاف مصلحت ہے اگر وہ قتل

---

[1] ابن ج ا صفحہ ۲۰۳ [2] ابن ج ا صفحہ ۲۸۰ [3] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۷۵ [4] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۸۲

[5] تذ۔ ج ا صفحہ ۳۰۳ [6] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۲ [7] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۷۹

کیے گئے تو یاد رکھو کہ عراق کے شیعوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ قتل ہو جائیگی[1]

غیر مذہب کے لوگوں کی محبّت علماء کے ساتھ

عباد ابن عوام ناقل ہیں کہ جب امام منصور تابعی کا جنازہ اٹھایا گیا تو میں حاضر تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصاریٰ اپنے اپنے گروہ جدا جدا قائم کیے ہوئے جنازے کے ساتھ ساتھ تھے[2]۔ امام ابو العلاء کبھی کبھی (ہمدان سے) اپنے وطن کو جمعہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جب وہ تشریف لے جاتے تو اہل شہر اُن کی مشایعت کے لئے شہر سے باہر کھڑے ہو جاتے۔ ایک جماعت مسلمانوں کی ہوتی اور ایک گروہ یہودیوں کا۔ جب اُن کو دیکھتے تو دونوں فریق دعا دیتے[3]۔ ابو الفتح کمال الدین شافعی کے پاس یہود اور نصاریٰ توراۃ اور انجیل پڑھنے آیا کرتے تھے۔ فقیہ ممدوح نے اُن کے ماننے والوں کی خاطر ان دونوں کتابوں کی شرح لکھی تھی[4]۔ امین الدولہ ابن تلمیذ بغداد کے مشہور عیسائی طبیب کا مکان شہرۂ روزگار مدرسۂ نظامیہ کے پڑوس میں تھا۔ جب کوئی طالب علم مدرسۂ مذکور کا بیمار ہوتا تو یہ نیک دل طبیب اُس کو اپنے مکان پر لے آتا۔ اُس کا علاج کرتا اور ہر قسم کی آسائش کی خبر رکھتا اور بعد صحت پھر مدرسے میں پہنچا دیتا۔ طبیب موصوف کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب نفس اور شرافت خصلت میں وہ بے نظیر تھا۔ جب اُس نے وفات پائی تو (ابن خلکان کہتے ہیں) کہ شہر بغداد کے دونوں حصّوں میں کوئی قابل ذکر شخص ایسا نہ تھا جو اُس کے جنازے کے ساتھ گرجے میں نہ آیا ہو[5]۔

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۴ [2] تذ ج ۱ صفحہ ۱۲۰ [3] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۰
[4] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۴ [5] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹۳

علما کی معاشرت کے متعلق بعض اور حالات

اُن کا لباس

عرب کا ایک مشہور مقولہ ہے الناس باللباس علمائے کرام جو باطنی خوبیوں سے آراستہ تھے اُن کے حالات شاہد ہیں کہ ظاہری صفائی اور پاکیزگی کی جانب سے بھی اُن کو بے توجہی نہ تھی۔ مطرف بن عبداللہ پوشاک فاخرہ استعمال کرتے تھے[1]۔ امام دار الہجرت حضرت مالک لباس نہایت پاکیزہ اور قیمتی پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے اپنے شہر (مدینہ طیبہ) کے جتنے فقہا دیکھے سب کو خوش پوشاک دیکھا امام ممدوح جس مکان میں نشست فرماتے تھے وہ نہایت پاک صاف رہتا تھا۔ اُس میں چاروں طرف مسندیں بچھی رہتی تھیں اور ہر مسند پر جدا جدا تکیے مہیا رہتے۔ اُن کی مجلس کا یہ داب تھا کہ کوئی بلند آواز سے بات نہ کرتا[2]۔ امام ابو حنیفہ بھی بہت خوش لباس تھے حضرت عبداللہ ابن مبارک اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان حسن الوجہ حسن الثیاب[3] ایک مرتبہ اُن کی ایک چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا۔ اور ایک دوسرے موقع پر اُن کے پیراہن اور چادر کا اندازہ کیا گیا تو چار سو درہم ہوا۔ حماد اُن کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد اس قدر خوشبو کا استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کہیں جاتے تو لوگ خوشبو کی وجہ سے پہلے ہی سمجھ جاتے کہ امام اعظم آرہے ہیں[4] شیخ الاسلام جعفی پاکیزہ لباس پہنتے[5]۔ شیخ الاسلام ہروی جن کا زہد مشہور ہے۔ جب باہر تشریف لاتے تو لباس فاخرہ اُن کے جسم پر ہوتا اور بیش قیمت گھوڑا اُن کے نیچے اور فرمایا کرتے تھے کہ افعل ھذا اعزاز الدین یعنی میں یہ اظہارِ حشمت دین کے معزز کرنے کے لیے

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۵۶ [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۹۱ [3] صورت اور لباس دونوں پاکیزہ تھے
[4] خیرات حسان صفحہ ۲۲ و ۴۱ [5] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۴۳

کرتا ہوں۔ [لہ]

جسمانی ریاضت

ہم نے اس تحریر میں بعض عنوان ایسے قائم کئے ہیں جو نظر بحالات موجودہ علمائے کرام کے ذکر میں اجنبی بلکہ بے محل معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے غالباً یہ سرخی بھی ہے۔ ہمارے قدیم مدارس میں جسمانی ریاضت کا مزلوں پتا نہیں ہے۔ مدارسِ جدیدہ تعلیم علوم کے برابر اس کو بھی مہتم بالشان خیال کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں کے دو مختلف اثر پیدا ہوئے ہیں۔ نئی روشنی کے لوگ تو اس کو ترقی جدید کا ایک جلوہ سمجھ رہے ہیں۔ پرانے فیشن کے بزرگ اس کو داخل لہو و لعب اور ثقاقت و متانت کے خلاف تصور فرما رہے ہیں۔ تاریخی عدالت سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ دونوں خیال واقعیت سے دور ہیں۔ اہل علم میں جسمانی ریاضت کا اہتمام نہ تہذیب جدید کا نتیجہ ہے اور نہ خلافِ متانت و وقار ہے۔ صدہا برس گزرے جب بھی ہمارے علما مردانہ ورزشوں کے پابند تھے اور جو لوگ پیشوائے امت مانے گئے ہیں انھوں نے اس کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے لہٰذا اس طریقے کو نہ جدید کہہ سکتے ہیں نہ خلافِ شانِ علما۔ علما کے حالات ایک طرف تیر اندازی اور گھوڑے کی سواری کی مشق کی تاکید حضرت سرور کائنات صلعم نے فرمائی ہے۔ اور صحیح بخاری میں اس گھوڑدوڑ کا ذکر ہے جس کا اہتمام آپ نے بہ نفسِ نفیس فرمایا تھا اور جس میں عبداللہ ابن عمر بھی ایک گھوڑے پر سوار تھے اور اس اونٹوں کی دوڑ کا تذکرہ ہے جس میں آں حضرت کی سواری کی اونٹنی دوڑی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی ریاضت ہمارے اہل علم کا خاص شعار ہونا چاہیئے۔ اس رسالے کی تحریر کے لئے جو کتابیں میں نے دیکھیں ان سے ثابت ہوا کہ علمائے سلف کی عمریں عموماً بڑی ہوتی ہیں اور

لہ تذ - ج ۳ - صفحہ ۳۸۱

اخیر عمر تک اُن کے قویٰ کام دیتے رہے ہیں[1]۔ یہ حقیقۃً اُسی ریاضت کا کرشمہ تھا جس کے وہ عادی تھے۔ ورنہ اس زمانے کی طرح ضعف دماغ اور جسمانی کمزوری اُس زمانے کے علما کی بھی خاص علامت قرار پاتی۔

امام ابن عون تابعی کے حالات میں لکھا ہے کہ اُن کو گھوڑے کی سواری کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے گورخر میدان میں گھیر کر مارا تھا[2]۔ گورخر کی چالاکی مشہور ہے اُس کو میدان میں گھیرنا اور تلوار نیزہ یا تیر سے شکار کرنا بہت دشوار ہے۔ اس واقعے سے امام ممدوح سے اعلیٰ درجہ کی شہسواری اور فنون شکار سے پوری واقفیت کا نشان ملتا ہے۔ امام شافعی نے تیراندازی میں وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ قریش میں اُن کا ثانی نہ تھا اور یہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ اُن کے دس تیر دس نشانے اُڑا دیتے تھے[3]۔ امام بخاری کو بھی تیراندازی کا خاص شوق تھا اور اکثر گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے باہر اُس کی مشق کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اُن کا ہات بھی ایسا سچا ہو گیا تھا کہ کم تیر خطا جاتے[4]۔ علامہ ابوالقاسم شافعی کی نسبت ابن خلکان لکھتے ہیں کان علامۃ فی الفقہ والتفسیر والحدیث والاصول والادب والشعر وعلم التصوف جمع بین الشریعۃ والحقیقۃ جو لوگ ابن خلکان کی پُراحتیاط روش تحریر سے واقف ہیں وہ میرے اس بیان کی تصدیق کرینگے کہ مورخ مذکور نے یہ الفاظ محض گرمی سخن اور آرایش بیان کے واسطے نہیں لکھے ہونگے بلکہ واقعہ نے یہ الفاظ اُن کے قلم سے لکھوائے ہونگے ہم کو اس موقع پر یہ بیان کرنا ہے کہ علامہ ممدوح کو اتنے علوم میں کمال پیدا کرنے کے ولولے میں بھی جسمانی ورزش اور فنون ریاضت کی طرف سے کبھی بے توجہی نہیں ہوئی اور اُن مشاغل عالیہ کے

---

[1] علامہ عینی نے ہدایہ کی شرح بنایہ جب لکھی تو اُن کا سن نوّے برس سے تجاوز کر چکا تھا۔ کتاب مذکور کے خاتمہ میں اُنھوں نے اس امر کی تشریح کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس شرح کے لکھنے کا اتفاق اکثر شب کو ہوا۔ ۱۲

[2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۴۰ [3] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۱ [4] مقدمہ صفحہ ۵۶۶

ساتھ ساتھ انھوں نے گھوڑے کی سواری اور مردانہ فنون میں وہ مشق بہم پہنچائی کہ اُن کی چابک سواری اور استعمال اسلحہ کی مہارت مرتبۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔[1]

اپنا کام خود کرنا جو لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں اُن کو اپنی ذات پر بھروسا اور اعتماد ہوتا ہے اور اسی اعتماد نے دنیا میں بڑے بڑے کرشمے دکھلائے ہیں۔ جو لوگ اپنا کام خود نہیں کرتے اُن کے دل میں ایک قسم کی بزدلی پیدا ہوتی ہے اور یہ بزدلی انسانی حوصلے اور عزم کا بالکل ستیاناس کردیتی ہے۔ حضرت سرور کائنات کے حالات مبارک میں لکھا ہے کہ حضور اپنا کام خود دست مبارک سے فرمایا کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ آپ دوھ لیتے۔ پھٹا کپڑا خود سی لیتے۔ نعلین مبارک ٹوٹ جاتیں تو اُن کو اپنے ہی ہات سے گانٹھ لیتے۔ غرض اپنے کام کے لئے دوسروں کو کم تکلیف دیتے۔ آپکے خادم حضرت انس فرماتے ہیں کہ دس برس میں آپ کی خدمت میں رہا اس عرصہ میں میں نے آپ کی خدمت اس قدر نہیں کی جتنے آپنے میرے کام فرما دیئے۔ علمائے سلف کے حالات شاہد ہیں کہ انھوں نے اپنے پیشوائے ملت (روحی فداہ) سے یہ سبق بھی حاصل کیا تھا اور جو قوی خداوند تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے تھے اُن کا پورا شکر بجا لاتے تھے۔ امام ابن طاہر جب فن حدیث کی تحصیل کے لئے امام حبال کی خدمت میں حاضر ہونے چلے تو لوگوں نے اُن کو بتایا کہ امام موصوف بازار سے اپنا کام خود کر لاتے ہیں وہاں بھی اُن کو تلاش کرلینا۔ چنانچہ جب یہ اُن کے شہر میں وارد ہوئے تو اول بازار ہی میں گشت لگایا۔ تلاش کرتے کرتے اُن کو امام حبال ایک عطار کی دکان پر اس ہیئت سے ملے کہ دامن میں وہ تمام ضرورت کی چیزیں بھری ہوئی تھیں جو بازار سے خرید کر لائے تھے۔ اس واقعے کی قدر اُس وقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام ممدوح کی عمر اُس زمانے میں اُناسی برس کی تھی۔[2]

---

[1] ابن ۔ ج ۱ صفحہ ۳۰۰ [2] تذ ۔ ج صفحہ ۳۸۵

ابو الاسود دؤلی واضع فن نحو پر اخیر عمر میں فالج گرا تھا اور اُس کے اثر سے اُ
ہات پاؤں ماؤف ہو گئے تھے۔ اس معذوری کی حالت میں بھی وہ ہر روز پاؤں گھ
بازار کو جاتے اور اپنا کام کرلاتے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ضرورت اُن کو اس تکلیف کر
مجبور کرتی تھی۔ کیوں کہ ابو الاسود بہت آسودہ تھے اور بہت سے خادم اُن کی سرکار
رہتے۔ ایک روز کسی نے اُن سے ازراہِ تعجب دریافت کیا کہ اس قدر خادموں کے ہوتے ہو
یہ شاقہ مصیبت ہر روز کیوں برداشت کی جاتی ہے۔ اُس ادیب نے یہ بے مثل جواب دیا کہ
کہ اس آمد و شد میں اتنا نفع ہے کہ جب میں گھر میں لوٹ کر آتا ہوں تو لڑکے بھی کہتے ہیں ک
لونڈیاں بھی کہتی ہیں کہ آ گئے۔ اگر گھر میں پاشکستہ ہو کر پڑ رہوں تو بکریاں مجھ پر پیشاب
کریں تو بھی کوئی خبر نہ ہو[1]۔ یہ مقولہ عجب حکمت انگیز ہے اور شخصی حالت سے لے کر قومی ح
یکساں مؤثر ہے۔ دنیا میں جو کچھ گرمیٔ ہنگامہ ہے وہ سب حرکت کا نتیجہ ہے اور سکون ملکوں
قوموں کی رونق کو درہم برہم کرنے والا ہے۔ جو قومیں ہات پاؤں چھوڑ بیٹھی ہیں وہ پا
سوا اور کس چیز کی توقع اس عالم میں رکھتی ہیں۔ امام بخاری نے شہر بخارا کے باہر ا
مہمان سرا بنوائی تھی۔ اُس کی تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے
میں خود امام بخاری بھی شامل تھے۔ یہ امام ربّانی اپنے سر پر اینٹیں رکھ کر لے جاتے اور
کو دیتے۔ ایک شاگرد نے ازراہ دل سوزی ایسا عرض کی کہ آپ کو اس محنت
کیا ضرورت ہے۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ ھٰذَا الَّذِیْ یَنْفَعُنِیْ[2]۔ نفعنا اللّٰہ تع
باتباع السلف الصٰلحین و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالم

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۸۱ ۲ [2] یہ وہ کام ہے جو مجھکو نفع دیگا [3] مقدمہ صفحہ ۵۶۷

تمت